Osmania University Library

Call No. ۹۱۴ د ۲۱
ا - ل

Name of Book لیفٹننٹ آداب عرض

Name of Author آغا محمد اشرف

۹۱۴ د ۲۱
ا - ل

UNIVERSAL LIBRARY
OU_188881
UNIVERSAL LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ٩١٤٫٢١ Accession No. ١٤٥٢٤

Author اشرف، آغا محمد ا - ل

Title اوزان سے اردو ادب عروض

This book should be returned on or before the date last marked below.

لندن سے آداب عرض

ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء - ستمبر سنہ ۱۹۴۳ء

آغا محمد اشرف

ناشر

حالی پبلشنگ ہاؤس "کتاب گھر" دہلی

سنہ ۱۹۴۴ء

قیمت عہ

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

مطبوعہ جیّد برقی پریس ۔ دہلی

ہیلن کے نام

میں نے یہ مضمون کیوں لکھے

چار سال تک میں سلطنت برطانیہ کے دل یعنی لندن شہر میں بیٹھا لڑائی کی حالت دیکھتا رہا۔ لڑائی شروع ہوئی تو میرا جہاز بحرِ ہند میں بھٹک رہا تھا۔ اس کے بعد لندن پر بم گرتے، مکانوں کو برباد ہوتے، ہزاروں بے گناہوں کو اس بم باری میں ہلاک ہوتے۔ تاجداروں کے تاج چھنتے اور بادشاہوں کو تخت سے اُترتے میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا بی۔ بی۔ سی سے میرا تعلق جون ۱۹۴۰ء میں ہوا۔ اس سلسلے میں لڑائی کے ہر ہر پہلو کو دیکھنا اور اس پر غور کرنا میرا فرض تھا۔ اور ہر بات کو میں نے صرف دیکھا ہی نہیں بلکہ اُسے سمجھنے کی کوشش بھی کی۔ میرے منصبی فرائض میں یہ بات بھی داخل تھی کہ جو کچھ دیکھوں اور جس بات کا جیسا بھی میرے دل پر اثر ہوا اُسے ریڈیو کے ذریعے اپنے ہم وطنوں تک پہنچا دوں۔ چنانچہ لڑائی کے ہر دَور نے جو اثر مجھ پر کیا، وہ میں نے نہایت صفائی سے کاغذ پر لکھ لیا۔ لیکن یہ تمام تاثرات میری ذہنی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ کسی کے

حکم سے انھیں یہ رنگ نہیں دیا گیا۔

انگلستان میں اگرچہ میں پہلے لندن یونیورسٹی کے ایک اُستاد کی حیثیت سے گیا تھا۔ اور بعد میں بی۔ بی۔ سی کی ملازمت میں داخل ہوا۔ لیکن ان چار سال تک ہر وقت میں اپنے آپ کو طالب علم سمجھتا رہا۔ اور جس طرح ایک طالب علم اپنے گرد وپیش کے حالات پر غور کرتا ہے۔ حالات کو سمجھتا ہے۔ دوسروں کی رائے پرکھتا ہے۔ یہی حال میرا رہا۔ اور میں نہایت سچائی سے کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ میں نے دیکھا یا سُنا۔ اُس پر غور کرنے کے بعد اُسے میں نے ان مضمونوں کی صورت میں لکھ ڈالا۔

تاریخ ہمیشہ گذرے ہوئے واقعات کی لکھی جاتی ہے۔ کیونکہ اسوقت مورّخ ماضی کے حالات پر بے لاگ رائے دے سکتا ہے۔ اسلئے میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ میرے مضامین اس جنگ کی تاریخ ہیں۔ انھیں میں ایک جنگی پرچہ نویس کی ڈائری کا درجہ دیتا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ میری رائے غلط ہو۔ میں نے بعض باتوں کو غلط نگاہ سے دیکھا ہو۔ اور بعد کی تحقیق میری رائے کو رد کرے۔ اس کا فیصلہ آنے والا زمانہ کرے گا۔

یہاں میں اپنے ان چار سال کے تجربوں کو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ لڑائی کے بعد جب سب حالات آپ کے

سامنے آجائیں۔ تو یہ مضامین اُن حالات کو سمجھنے میں آپ کی مدد کریں۔
اس لڑائی کا کیا نتیجہ ہوگا۔ تو میں آپس کے معاملات کس طرح
سلجھائیں گی۔ دنیا کا نقشہ نئے سرے سے کیسے تیار کیا جائیگا۔ اِن سب باتوں
سے میرا تعلق نہیں۔ البتہ میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ نیا نقشہ بننے سے
پہلے دنیا میں کیا ہوا۔

میرا جہاز اس وقت بحیرۂ روم کے اُس حصے میں سے گذر رہا ہے
کہ جہاں چند مہینے پہلے دنیا کی ایک زبردست لڑائی ہو چکی ہے اور
اس سمندر کی تہ میں خدا جانے کتنے جہاز اور انسان ڈوب چکے ہیں
اسوقت ہمارا جہازی قافلہ نہایت بے باکی سے نہر سوئز کی طرف
بڑھ رہا ہے۔ چند دن بعد مجھے ہندستان کا ساحل نظر آجائیگا۔
اور میں اپنے وطن کی خاک پر دوبارہ قدم رکھونگا لیکن انگلستان
کے یہ چار سال میں ہرگز نہیں بھول سکتا۔ اِن چار سال کے
اندر میں نے بہت سے تجربے حاصل کئے ہیں۔ بہت سے نئے
دوست بنائے ہیں۔ بہت سی کام کی باتیں سیکھی ہیں۔ اور ان
سب باتوں کے لئے میں اپنے مہربانوں کا شکر گذار ہوں۔
اُن مہربانوں کا کہ جنہوں نے مجھ جیسے پردیسی کو اپنے وطن میں جگہ دی
اور مجھے کبھی یہ محسوس ہونے نہ دیا کہ میں اپنے وطن سے ہزاروں

نہیں ہو رہا ہوں۔ ایسے لوگوں کے ناموں کی فہرست بہت لمبی ہے
یہاں صرف اپنے دوست سر مالکم ڈارلنگ کا ذکر میں نہایت
ضروری سمجھتا ہوں، کہ انہوں نے مجھے اپنے بچوں کی طرح سمجھا
اور ہر وقت میری رہنمائی کی۔

محمد اشرف
یکم ستمبر ۱۹۴۳ء

فہرست مضامین

۱	ہندستان سے روانگی	۱
۲	یہ لندن ہے۔	۱۱
۳	لندن میں اردو	۲۹
۴	ڈاکٹر گراہم بیلی	۳۶
۵	کیمبرج میں ہندستانی طالب علم	۴۶
۶	وزیر ہند سے ملاقات	۶۷
۷	پارلیمنٹ میں ہندستان پر بحث	۷۷
۸	ہاؤس آف لارڈز	۸۲
۹	پارلیمنٹ میں مسٹر چرچل کی تقریر	۸۷
۱۰	لارڈ ولنگڈن کا جنازہ	۹۴
۱۱	لارڈ ویول	۹۸
۱۲	جرمن قیدیوں کا جہاز	۱۰۴
۱۳	رائل آرٹ گیلری	۱۰۹
۱۴	ایک گولہ	۱۱۴
۱۵	لندن سے آداب عرض	۱۲۰
۱۶	لندن کی ایک کھڑکی	۱۳۵
۱۷	ہنوز دلی دور	۱۴۵
۱۸	لندن سے روانگی	۱۵۹
۱۹	یہ چار سال	۱۶۶

ہندستان سے روانگی

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کی صبح کو بمبئی کے اخباروں میں یہ خبر صرف افواہ کے طور پر چھپی تھی کہ جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ لیکن کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی لڑائی چھڑ گئی۔ اگرچہ جنگ کے ہولناک بادل دنیا پر کئی مہینے سے چھا رہے تھے مگر یہ طوفان ابھی برسا نہیں تھا۔ اور سب کے دلوں میں اُمید کی ایک ہلکی سی کرن باقی تھی جو یاس و حرماں میں عافیت اور امن کی آس دلا رہی تھی۔ یکم ستمبر تک بمبئی کے بازاروں میں رونق اور چہل پہل کا وہی عالم تھا لیکن تجارتی اور مالی حلقوں میں پریشانی کے آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ اور اخباروں کی سُرخیاں کئی دن سے ایک بدلتی ہوئی دنیا کا پتہ دے رہی تھیں +

میں ۳۱ اگست کو ٹامس کُک کے دفتر میں گیا۔ اُس وقت تک نیم سرکاری طور پر اعلان ہو چکا تھا کہ اب جہاز نہر سوئیز کے راستے یورپ نہیں جا سکتے۔ بلکہ آئندہ برطانی جہاز جنوبی افریقہ کا چکر کاٹ کر

انگلستان جایا کریں گے۔ گویا اس طرح ۱۴-۱۵ دن کا راستہ بڑھ کر چھ ہفتے کا بن چکا تھا۔ اور اس بات سے مسافروں میں ایک عجیب کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ میں جہازی کمپنی کے دفتر میں مشکل سے آدھ گھنٹے ٹھہرا۔ مگر اس عرصے میں درجنوں مسافروں نے اپنے ٹکٹ منسوخ کرا لئے۔ کلرک نے میری طرف بھی معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ مگر میں نے اُسے آخری مرتبہ پھر ہدایت کی کہ میرا ٹکٹ انگلستان تک کا رہے گا۔ غالباً اس نے مجھے زیادہ سمجھانے کے لئے کہا کہ ہمیں انگلستان کی کسی خاص بندرگاہ پر پہنچنے کی ہدایت نہیں ملی۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنے ٹکٹ کا روپیہ ادا کر کے ہوٹل چلا آیا۔

یکم ستمبر کو ہمارا جہاز دن کے ایک بجے چلنے والا تھا لیکن میں گیارہ بجے ہی سے بندرگاہ پر جا پہنچا۔ کیونکہ ڈاکٹری معائنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔ میرا خیال تھا کہ جہاز کے مسافروں کی بندرگاہ پر ریل پیل ہوگی۔ مگر مشکل سے ۳۰-۴۰ مسافر ٹہل رہے تھے۔

چند منٹ بعد میرا سامان جہاز پر پہنچا دیا گیا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے میں بھی تختے پر جا پہنچا۔ میرے ساتھ میرے ایک شاگرد لندن جانے والے تھے۔ انھیں میں نے تلاش کیا مگر مجھے یہ کہیں نظر نہیں آئے جب میں دوسرے مسافروں کا جہاز پر سے تماشہ دیکھ رہا تھا تو زینے پر یہ کھڑے

نظر آئے۔ اور ان کے والدین کے ساتھ تھے۔ معلوم ہوا کہ لڑائی کے خطرے نے ان کا جانا بھی روک دیا۔ ڈھائی بجے کے قریب ہمارے جہاز نے لنگر اٹھایا۔ بمبئی۔ بمبئی کی عمارتیں اور گیٹ وے آف انڈیا آہستہ آہستہ آنکھوں سے اوجھل ہونے شروع ہوئے۔ میں نے جہاز پر دیکھا تو ۳۴۔۳۵ مسافر عرشے پر کھڑے زمین کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ یہ سب انگریز تھے۔ اور صرف ہندوستانی مسافر میں تنہا تھا۔ اتنے میں مجھے چکر آیا۔ اور میں آنکھیں بند کر کے عرشے پر ہی بیٹھ گیا۔

دوسرے روز صبح کو جب جہاز کا ملازم چائے لایا تو اس کی زبانی معلوم ہوا کہ واقعی جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد پھر مجھے چکّروں نے بے ہوش سا کر دیا۔ تیسرے دن اسی ملازم کی زبانی معلوم ہوا کہ انگلستان کے وزیرِ اعظم مسٹر چیمبرلین نے ریڈیو پر جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کیا ہے۔ اِس طرح میں نے دنیا کی اس عالمگیر جنگ کے چھڑنے کا حال سُنا کہ جس کی بہت سی باتیں میں اپنی آنکھ سے دیکھنے والا تھا۔

اس خبر سے جہاز پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ رات کو جہاز کی تمام روشنیاں چھپا دی جاتی تھیں۔ عرشے پر کسی کو سگرٹ تک پینے کی اجازت نہیں تھی۔ جہاز کے چار افسر دن رات اوپر کھڑے چاروں سمت ٹکٹکی باندھے

نگہبانی کرتے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک کو گیس سے بچنے کے لئے ایک ٹوپ سا مل گیا۔ ہر شخص سمندر میں تیرانے والی پیٹی کمر پر اُٹھائے پھرتا تھا۔ اور کسی کو خبر نہیں تھی کہ ہمارا جہاز کہاں جا رہا ہے اور کب لندن پہنچیگا۔ ریڈیو پر اکثر جنگ کی خبریں سنتے تھے۔ ان سے پتہ چلتا تھا کہ جرمن آبدوز کشتیوں کے برطانی جہازوں پر زبردست حملے شروع ہو گئے۔ اور ان خبروں کو سُن سُن کر مسافروں کی پریشانی اور بڑھ رہی تھی۔ دسویں دن سمندر میں دُور سے ہمیں ایک اور جہاز اپنی طرف آتا نظر آیا۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ کہیں غنیم کا کوئی چھاپے مار جہاز نہ ہو۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ ایک اور برطانی جہاز ہے جو عدن سے واپس ہو کر کیپ ٹاؤن جا رہا ہے۔ چودہ دن تک سمندر اور آسمان دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔ نہ کسی کھیل کو دمیں جی لگتا تھا۔ نہ پڑھنے لکھنے کو طبیعت چاہتی تھی۔ جہاز کے افسر ہر بات مخفی رکھنی چاہتے تھے۔ اس سے دل اور پریشان ہوا جاتا تھا۔ آخر خدا خدا کرکے چودھویں دن صبح کو افق پر پہاڑوں کا گمان ہوا۔ دس بجے تک یہ نشان اور گہرے ہو گئے اور دوپہر کو ایک ڈیڑھ بجے ہمارا جہاز جنوبی افریقہ کی مشہور بندرگاہ کیپ ٹاؤن پر جا لگا۔ اتنے دن بعد خشکی کی شکل دیکھ کر ہم سب خطرے بھول گئے۔ اور یہی جی چاہا کہ زمین پر کم سے کم چند قدم چلنے کی اجازت

مل جائے +

جہاز نے بندرگاہ پر لنگر ڈالا اور میں ایک دوست کے ساتھ کیپ ٹاؤن کی سیر کو نکلا۔ یہ تو میں نے جہاز پر سے ہی دیکھ لیا تھا کہ سمندر کے کنارے شہر کئی میل تک ایک اونچے پہاڑ کی تلہٹی میں آباد ہے اور یہ پہاڑ اوپر جا کر بالکل میز کی طرح سپاٹ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے ٹیبل ماؤنٹین کہتے ہیں۔ بندرگاہ پر سینکڑوں حبشی مزدور کام کر رہے تھے ہر ایک کا لباس انگریزی تھا۔ اور ہر مزدور کے منہ میں پائپ لگا ہوا تھا۔ ہندستانی کسانوں اور مزدوروں کے متعلق عام طور سے کہا جاتا ہے کہ یہ اپنا بہت سا وقت حقہ پینے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ کم از کم پائپ نے یہ شکایت رفع کر دی +

ہم موٹر بس کے ذریعے بندرگاہ سے شہر گئے۔ جو یہاں سے شکل میں سوا میل ہوگا۔ کیپ ٹاؤن میں گوری نسل کے باشندے زیادہ خوش حال ہیں۔ یہ عام طور سے ہالینڈ کے رہنے والے ہیں لیکن اب ایک مدت سے یہیں آکر آباد ہو گئے۔ اس لئے انھیں شہریت کے سب حق حاصل ہیں۔ اور بازار میں تجارت بھی انہی کے ہاتھ میں نظر آتی ہے۔ چنانچہ شہر کی بڑی بڑی دکانیں، اونچے اونچے مکان اور شاندار موٹریں ان کی خوش حالی کا پتہ دیتی ہیں۔ یہ میں پہلے ہی سن چکا تھا کہ جنوبی

افریقہ میں کالی اور گوری نسلوں میں کشیدگی بہت بڑھی ہوئی ہے۔ اور گوری رنگت والے کالی نسل کے لوگوں سے بہت بُرا سلوک کرتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مہاتما گاندھی نے سب سے پہلے ستیہ گرہ اسی ملک میں اور اسی بات پر شروع کیا تھا۔ اب بازاروں میں میں نے اپنی آنکھ سے بعض قہوہ خانوں اور ہوٹلوں پر لکھا دیکھا "صرف یورپین باشندوں کے لئے" اسی کے پہلو میں کسی ستم ظریف نے دوسری دُکان پر تختہ لٹکا رکھا تھا۔ "صرف غیر یورپین باشندوں کے واسطے"

میں نے سنا ہے کہ جنوبی اور مشرقی افریقہ کے بعض شہروں میں کالی نسل والوں کو ٹرام اور موٹر بس میں بھی سفید فام لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایک شب مجھ کو میرے ایک انگریز دوست اپنے ساتھ سینما لے گئے۔ چونکہ ٹکٹ اُنہوں نے خود خریدا تھا اس لئے دو ٹکٹ تو مل گئے لیکن جب ہم سینما کے اندر جانے لگے تو منیجر نے آکر کہا۔ میں قاعدے سے مجبور ہوں۔ آپ کے ساتھی چونکہ ہندستانی ہیں اسلئے اندر نہیں جاسکتے۔ اگر یہ سینما میں گھس گئے تو سب سفید نسل والے سینما چھوڑکر چلے جائیں گے۔ یہ سُن کر ہم دونوں واپس چلے آئے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ہندستان کے ایجنٹ جنرل بھی اس عجیب وغریب دستور کی زد سے بچ نہیں سکتے۔

کیپ ٹاؤن کا باغ اور اس باغ کی گلہریاں مجھے تمام عمر یاد رہیں گی۔ اس باغ کی سیر کے لئے ہزاروں آدمی آتے ہیں۔ اور گلہریاں اُن سے اسقدر ہل گئی ہیں کہ بلا تکلّف آکر سب کے ساتھ کھیلتی ہیں اور آپ کے قدموں میں آکر اس طرح لوٹتی ہیں جیسے مدّت کی جان پہچان ہو۔ اسی باغ میں ایک بہت بڑا عجائب گھر ہے۔ اور عجائب گھر کے سامنے سیسل روڈز کا بُت نصب ہے۔ سیسل روڈز انیسویں صدی میں ہیرے نکالنے کی غرض سے جنوبی افریقہ آیا اور یہیں آباد ہو گیا۔ اس نے جنوبی افریقہ میں برطانیہ کے لئے ایک نیا راستہ نکالا تھا۔ اور اب تک انگریز قوم اسے بہت بڑے محسن کی حیثیت سے یاد کرتی ہے جس گھر میں روڈز رہتا تھا وہ اب تک آثار قدیم کے طور پر موجود ہے۔ اور بہت دُور دُور سے لوگ اس کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ کیپ ٹاؤن کے قریب ہی ایک بڑا جنگل اس کی یاد میں قایم کیا گیا ہے۔ اور اس جنگل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سینکڑوں جنگلی جانور اس میں بالکل آزاد کھلے پھرتے ہیں۔ جنگل میں پہاڑ کے کونے پر ایک مُنہ زور گھوڑے کا بُت کھڑا ہے۔ جیسے ایک طاقتور آدمی قبضے میں لانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسی یادگار کے پاس کیپ ٹاؤن کی یونیورسٹی ہے جہاں انجینیری اور ڈاکٹری کی تعلیم کا خاص طور سے بہت عمدہ بندوبست ہے۔

جنوبی افریقہ میں بہت سے ہندستانی بھی آباد ہیں۔ اور ان میں سے اکثر بہت مالدار اور خوشحال ہیں۔ سنا ہے کہ پھلوں کی تجارت پر تمام تر ہندستانیوں کا قبضہ ہے۔ اور یہ شہر کے ایک خاص حصے میں گوری نسل والوں سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ لڑائی کی وجہ سے اب بہت سے برطانی جہاز جنوبی افریقہ پہنچ چکے تھے۔ اور ان میں بہت کافی ہندستانی طالب علم بھی سوار تھے۔ ان میں سے چند کو میں پہلے سے جانتا تھا۔ باقی ہندستانی نوجوانوں سے وہیں ملاقات ہو گئی اور ہم سب مل کر ہندستانی باشندوں سے ملنے کو نکلے۔ جنوبی افریقہ میں ہندستانی کانگریس بہت عمدہ کام کر رہی ہے۔ اس کے سکریٹری فوراً ہماری مدد کے لئے آن پہنچے۔ بہت سے ہندستانی طالب علم ہندستان واپس جانا چاہتے تھے۔ ان کی کانگریس والوں نے بیحد مدد کی۔ بلکہ چند نوجوانوں کے پاس روپیہ نہیں تھا اور انھیں بغیر کسی دستاویز کے روپیہ تک دے دیا۔ اور ہماری دعوتیں تو اسقدر ہوئیں کہ ہم کھاتے کھاتے تھک گئے۔ ہر ہندستانی گھر کے سب لوگ ہماری خاطر مدارات میں بچھے جاتے تھے۔ اور ہم سے ایسا سلوک کرتے تھے جیسے مدت کے بچھڑے ہوئے دوست آن ملے ہوں ہندستانی طالب علموں میں بنگال۔ مدراس۔ یوپی اور پنجاب۔ غرض

سب صوبوں کے رہنے والے شامل تھے۔ مگر چند منٹ کے اندر ہم بھی ایک دوسرے سے اس طرح گھل مل گئے گویا ایک ہی خاندان کے افراد ہوں۔ وطن کی محبت اصل میں وطن سے باہر جاکر ہی ہوتی ہے۔ اور ہم وطن سے دُور اپنے تمام جھگڑے اور آپس کے امتیاز بالکل بھول جاتے ہیں +

ہم کوئی ایک ہفتے تک کیپ ٹاؤن میں ٹھہرے۔ اس عرصے میں لڑائی کے متعلق طرح طرح کی تشویشناک خبریں چلی آتی تھیں۔ ایک بہت بڑا برطانی جنگی جہاز ڈوب گیا۔ اس سے جہاز کے مسافروں میں اور پریشانی بڑھ گئی۔ ہمارے جہاز پر پہلے ہی کم مسافر تھے۔ ان میں سے دس بارہ مسافر اور کیپ ٹاؤن پر اُتر گئے۔ ایک موقع ایسا آیا کہ میری طبیعت میں بھی کمزوری آنے لگی۔ دل طرح طرح کے بہانے تراشنے لگا۔ لیکن پھر میں نے خدا پر بھروسہ کر لیا اور اپنے دل سے کہا۔ انسان موت سے ہندوستان میں بھی نہیں بچ سکتا۔ پھر یہ بے چینی کیسی۔ اس خیال سے میرے دل کو عجب تقویت ہوئی۔ اور چار سال تک جب کبھی مجھے لندن کی بمباری میں سے گزرنا پڑا ہمیشہ اس خیال نے میری ہمّت بندھائی

کیپ ٹاؤن سے ہمارا جہاز پھر تنِ تنہا سمندر میں چل نکلا۔ راستے میں چند روز مغربی افریقہ کی بندرگاہ فری ٹاؤن پر قیام کیا۔ یہاں بھی ہندوستانی تاجروں سے ملاقات کی۔ اور اس کے بعد ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۹ء

کی صبح کو ہم نے دُور سے انگلستان کا ساحل دیکھا۔ راستے میں جو طرح طرح کی پریشانیاں پیدا ہو رہی تھیں انگلستان کا ساحل دیکھتے ہی یہ سب یک قلم موقوف ہو گئیں، اور خدا کا نام لے کر ہیں لورپول کی بندرگاہ پر اُتر پڑا۔ جلدی سے اپنے گھر والوں کو خیریت کا تار دیا۔ اور اپنی سلامتی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ انگلستان دیکھنے کی کسے فرصت تھی۔ سفر سے حال بے حال تھا۔ اس لئے رات کے بارہ بجے کی ٹرین میں سامان رکھ کر سیدھا لندن کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہ لندن ہے

جانسن کا قول ہے کہ جو شخص لندن سے تنگ آجائے بس سمجھ لو کہ وہ اپنی جان سے تنگ آگیا اور اب اس کے لئے دنیا میں کہیں جگہ نہیں۔ لندن ایک شہر نہیں بلکہ ایک دنیا ہے کہ جس کی لپیٹ میں ہر نسل کے آدمی۔ ہر مذہب کے پیرو اور ہر خیال کے انسان آباد ہیں۔ لندن کے بازار۔ لندن کی گلیاں۔ لندن کے کوچے بھانت بھانت کے انسانوں سے بھرے پڑے ہیں اور اگر کوئی بارہ اور بارہ چوبیس برس لندن میں رہنے کے بعد بھی آپ سے یہ کہے کہ میں پورے لندن سے واقف ہوں۔ تو آپ اُس آدمی کی بات کا ہرگز یقین نہ کیجئے۔ کیونکہ کون ایسا سورما بہادر ہو سکتا ہے کہ جو سات سو مربع میل کے چپّے چپّے سے واقف ہو، کم از کم ایک انسان کے قبضۂ قدرت سے تو یہ باہر ہے کہ اتنے بڑے شہر کے ہر حصّے اور ہر ٹکڑے کو اچھی طرح جان پہچان لے۔ اور پھر اس طرح یاد رکھے کہ آنکھیں بند کر کے جہاں جی چاہے چلا جائے

پہلی مرتبہ میں اکتوبر ۱۹۳۹ء کی ایک صبح لندن کے یوسٹن اسٹیشن پر اترا صبح کے سات بجے تھے۔ اور وہ بھی سردیوں کی صبح۔ آدھا لندن ابھی اپنے

اپنے بستروں پر کروٹیں بدل رہا تھا اور آدھا لندن شاید ابھی دو چار گھنٹے ہوئے سویا تھا۔ کیونکہ ہفتے اتوار کی درمیانی شب میں یہاں بالکل رت جگا منایا جاتا ہے۔ میری موٹر لندن کی کشادہ سڑکوں پر سے فراٹے بھرتی ہوئی گذر رہی تھی۔ عالیشان عمارتیں۔ شاندار دکانیں۔ بڑے بڑے مکان وہ سب چیزیں موجود تھیں کہ جن کے مجموعے کا نام شہر ہے لیکن سڑکوں پر انسان اکا دکا ہی نظر آئے۔ کہیں کہیں دودھ والے گھوڑا گاڑی میں دودھ کی بوتلیں رکھے پھیری پر جا رہے تھے۔ کسی سڑک کے نکڑ پر اخبار والا نظر آ جاتا تھا۔ اسکے سوا ہر طرف خاموشی تھی۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ اور لندن میں اتوار کی صبح صرف آرام کے لئے مخصوص ہے ۔

اس روز دن بھر بارش ہوتی رہی۔ اگر اتوار کے دن اس ملک میں بارش ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ سب مزا کرکرا ہو گیا۔ تیسرے پہر تک میں ہوٹل ہی میں رہا۔ آخر جب ذرا جھڑی تھمی تو میں باہر نکلا۔ لندن میں کھیل تماشے سینما تھیٹر عام طور پر دن کے گیارہ بجے سے شروع ہو جاتے ہیں لیکن اتوار کو تیسرے پہر تک سب کام بند رہتے ہیں۔ جب میں باہر نکلا تو کہیں کہیں لوگ سینما کے سامنے قطار باندھے اندر جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ سڑکوں پر بھی خاصی چہل پہل تھی۔ ٹرام۔ بس۔ اور موٹریں بھی خوب چل رہی تھیں۔ لیکن دکانیں سب بند تھیں۔ میں ایک آدھ گھنٹہ ادھر ادھر پھر کر واپس آ گیا۔ کسی سے اس شہر میں

واقفیت نہ تھی اس لئے شام ہی کھانا کھا کر سو گیا۔ دوسرے دن مجھے خبر ملی کہ ہمارا کالج لندن سے اٹھ کر کیمبرج چلا گیا۔ گویا لندن میں مشکل سے چوبیس گھنٹے ٹھہرا اور اس چوبیس گھنٹے میں زیادہ عرصے تک بارش ہوتی رہی اور میں ہوٹل کے کمرے کے اندر بند رہا۔ اس لئے لندن کی پہلی جھلک میرے ذہن پر کوئی اچھا اثر قایم نہیں کر سکی ۔

دسمبر کی چھٹیوں میں کرسمس کے موقع پر مجھے پھر لندن آنے کا اتفاق ہوا۔ جنگ کے باوجود کرسمس کے دنوں میں لندن دلہن کی طرح سجا ہوا تھا جونہی میری ٹرین لنڈن کے اسٹیشن پر رکی مجھے فوراً احساس ہوا کہ میں اب دنیا کے سب سے بڑے شہر میں داخل ہو رہا ہوں۔ بازاروں کی رونق چہل پہل اور اس پر کرسمس کے تہوار کی گہما گہمی نے ایک سماں باندھ رکھا تھا۔ اگرچہ لڑائی کی وجہ سے شام کو چراغ جلے کے بعد ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا لیکن لندن کے نگر باسیوں کا ایک سیلاب تھا جو بازاروں اور سڑکوں پر موجیں مار رہا تھا۔ پکاڈلی۔ اکسفورڈ سرکس۔ ماربل آرچ۔ غرض کس کس جگہ کا نام لوں ہر جگہ معلوم ہوتا تھا کہ میلہ لگا ہوا ہے۔ دکانوں کے باہر کچھ یوں میں قسم قسم کی چیزیں اس خوبصورتی سے سجی ہوئی تھیں کہ ایک دفعہ اگر آپ کی نظر کہیں جم جائے تو پھر وہاں سے ہٹنے کو جی نہ چاہے۔ ہجوم میں عورتیں مرد۔ بوڑھے۔ بچے۔ اس طرح گتھے ہوئے تھے کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔

ہر شخص اپنے خیال میں مست چلا جاتا تھا۔ وہ تو یہ کہیے کہ آدھے سے زیادہ آدمی زمین دوز ریلوں میں سفر کرتے ہیں۔ اگر کہیں لندن کے سب شہری سڑکوں پہ چلنے لگیں تو شاید کھڑے ہونے کو جگہ بھی نہ ملے۔ کرسمس کا پورا ہفتہ اسی رونق میں گذر گیا۔ دن رات سینما اور تھیٹر تماشائیوں سے بھرے ہوئے تھے قہوہ خانوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ کھانے پینے والوں کا ایسا تانتا لگا ہوا تھا کہ ہوٹل کے ملازموں کو وارنہ ملتا تھا۔ ابھی ایک میز خالی ہوئی اور اس پر فوراً ہی ایک اور پارٹی جم گئی۔ سینکڑوں میزیں لگی ہوئی ہیں لیکن گاہک ہیں کہ پھر بھی کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ کمرے میں باجہ بج رہا ہے۔ یار دوست کھا پی رہے ہیں۔ قہقہے لگ رہے ہیں۔ گویا ایک جنّت ہے کہ "کسے را با کسے کارے نباشد" کا زندہ نمونہ آنکھوں کے سامنے ہے لڑائی کی وجہ سے ان مجمعوں میں زیادہ تعداد سپاہیوں کی نظر آتی تھی۔ یہ سپاہی اپنے کام سے ایک آدھ دن کی چھٹی پر لندن آتے ہیں۔ نوجوانوں کے ساتھ اُن کی دوست لڑکیاں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بیٹھی ہیں۔ کچھ بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ اور خوش ہیں۔ کون جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ اور کسے خبر ہے کہ یہ ملاقات اُن کی آخری ملاقات ہے۔ غرض ایک ہفتے تک کرسمس کا تہوار منایا گیا۔ اور اس رونق کا آخری منظر نئے سال کی رات کو پیش ہوا۔ اس رات کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سارا لندن اپنے اپنے گھروں سے نکل کر سنہ ۱۹۴۰ء کا استقبال

کرنے بازار میں آگیا ہے۔ رات کو دس بجے کے بعد سے کسی ہوٹل یا تھیٹر میں جگہ نہیں ملتی۔ لوگ بازاروں میں کھڑے ہیں۔ گذرنے کا راستہ نہیں۔ ناچ گھروں میں تِل دھرنے کو جگہ نہیں۔ کیونکہ تماشائیوں نے پہلے سے آکر اپنی اپنی جگہ پر قبضہ کرلیا ہے۔ جوں جوں رات بڑھتی گئی تماشائیوں میں ایک عجیب قسم کا والہانہ جوش بڑھتا گیا۔ اور رات کے بارہ بجے جبکہ لندن کے گھنٹوں نے ٹن ٹن بارہ بجا کر پرانے سال کو وداع اور نئے سال کا اعلان کیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دنیا ہی بدل گئی۔ اسوقت بلامبالغہ خوشی کے مارے لندن کا ایک نصف حصہ دوسرے نصف حصہ کو چوم رہا تھا۔ لوگ بازاروں میں ناچ رہے تھے۔ ہِل ہِل کر گا رہے تھے۔ شراب کی بوتلیں بازار میں ایک طرف سے دوسری طرف ہاتھوں ہاتھ بڑھتی چلی جارہی تھیں۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ جو سامنے آگیا وہ آپ کا دوست ہے اور جو آپ کے قریب سے ہٹ گیا اب اُس پر آپ کا حق نہیں رہا۔ وہ کسی اور کا دوست ہے۔ یہ لندن کی دوسری جھلک تھی

لندن کی تیسری جھلک دیکھنے کا اتفاق مجھے فروری ۱۹۴۷ء میں ہوا اس سال کہتے ہیں کہ کئی سو سال کے بعد اس غضب کی سردی پڑی تھی۔ برفباری کا یہ عالم تھا کہ سب طرف برف نظر آتی تھی۔ لندن کی عمارتوں پر سفید برف جم کر ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے پیرانہ سالی میں کسی بوڑھے سر پر سفید بال ہوں

برسا رہے ہوں۔ ہر شخص سردی کے مارے بھاری بھرکم کوٹوں میں سُکڑا دستانے پہنے جلدی جلدی قدم اٹھاتا نظر آتا تھا۔ کیونکہ اگر ایک جگہ کوئی کھڑا رہ گیا تو پھر سمجھ لیجئے کہ اس کے قدم جم گئے۔ خون کی حرارت اور گردش رکی اور آپ پر سردی چڑھی۔ اس برف باری کے باوجود لندن کی رونق میں کمی نہیں آئی۔ بلکہ اس سے لندن کا جوبن اور بھی نکھر آیا +

لندن کی چوتھی جھلک میں نے اس وقت دیکھی جبکہ دشمن نے ہالینڈ اور بلجیم پر حملہ کیا۔ اب تک لڑائی کا زور ہلکا تھا۔ اور لڑائی اس ملک سے دُور تھی لیکن اب کہ دشمن بالکل سر پر ہی آگیا بلجیم اور ہالینڈ کے میدانِ جنگ میں جس پھرتی سے برطانوی سپاہی بھیجے گئے ہیں وہ زمانہ یاد رہیگا اسٹیشن پر سپاہی اپنی بیویوں سے۔ اپنی بہنوں سے۔ اپنی ماؤں سے، اپنے بچوں سے اور اپنی دوستوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ سپاہیوں کی بندوقیں ریل میں سوار ہونے سے پہلے اُن کی دوست لڑکیاں اٹھا کر چلتی تھیں۔ اور لڑکیوں کا بندوق لے کر چلنا اب ایک فیشن ہو گیا تھا۔ جس پر ہر لڑکی کو فخر تھا۔ ریل کی سیٹی بجی۔ ایک ایک کھڑکی میں سے کئی کئی سپاہی جھکے۔ لڑکیوں نے آگے بڑھ کر انھیں آخری بار چوما۔ ریل چلی۔ رومال ہلے ہاتھ ہلے۔ لبوں پر مُسکراہٹ ہے۔ لیکن دلوں کا خدا حافظ ہے۔ جہانتک نظر نے کام کیا۔ لڑکیاں اپنے بہادر دوستوں کو دیکھتی رہیں۔ اس کے

بعد اسٹیشن پر کھڑے رہنا ناممکن ہے۔ سر جھک گئے۔ وہی رومال جو ابھی بہادرو کو الوداع کہنے کے لئے ہوا میں ہل رہے تھے۔ آنکھوں تک پہنچ گئے۔ جذبات کو کوئی کہاں تک دبا سکتا ہے۔ آخر دل ہی تو ہے +

۱۳ مئی ۱۹۴۰ء کو میں کیمبرج سے ایک دن کے لئے لندن گیا۔ اُس روز مجھے بی بی سی سے ایک تقریر براڈ کاسٹ کرنی تھی۔ تقریر براڈ کاسٹ کر کے سیدھا میں لورپول اسٹریٹ کے اسٹیشن پر پہنچا۔ لیکن اتفاق دیکھئے کہ چھ بجے والی گاڑی چھوٹ گئی تھی۔ اور دوسری گاڑی آٹھ بجے کیمبرج جاتی تھی۔ گویا مجھے دو گھنٹے اسٹیشن پر گزارنے تھے۔ پہلے تو ایک بُک اسٹال پر کھڑا اخبار رسالے۔ اور کتابیں دیکھتا رہا۔ لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ اب وہاں کھڑے کھڑے بہت دیر ہو گئی ہے۔ اور اسٹال کا مالک مجھے مُشتبہ نظروں سے دیکھ رہا ہے تو قریب ہی ایک چائے خانے میں گھس گیا۔ وہاں چائے وغیرہ پی گھڑی جو دیکھی تو پونے سات بجے تھے۔ اور گاڑی چلنے میں ابھی پورا سوا گھنٹہ باقی تھا۔ اس لئے باہر نکل کر پلیٹ فارم پر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ اس روز ہالینڈ پر جرمنوں نے زبردست حملہ کر دیا تھا اور ہمارے سپاہیوں کی رخصت بند ہو گئی تھی۔ اس لئے پلیٹ فارم پر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ ورنہ ان کی وجہ سے بہت رونق رہتی ہے۔ میں ادھر اُدھر ٹہل ہی رہا تھا کہ کچھ پولیس کے سپاہیو نے آکر پلیٹ فارم پر ایک جگہ سے لوگوں کو ہٹا دیا۔ لندن کی پولیس کے

سپاہی بہت لمبے اور سجیلے جوان ہوتے ہیں۔ جب بہت سے جوان ایک جگہ گھیرا باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ تو لوگوں کی جستجو بڑھی لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسکا مطلب کیا ہے۔ اتنے میں ایک لمبا، بھرے ہوئے جسم کا خوبصورت نوجوان نیلی وردی پہنے پلیٹ فارم پر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ بہت سے اور لوگ بھی تھے۔ جو وضع قطع سے غیر ملکی معلوم ہوتے تھے۔ اس نوجوان کی فوجی وردی بھی انگریزوں جیسی نہیں تھی۔ اب لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ تھوڑی دیر میں تمام تماشائی پہچان گئے کہ یہ جوان ہالینڈ کی شہزادی جولیانہ کے شوہر شہزادہ برنارڈ ہیں۔ اتنے میں کسی نے شام کا تازہ اخبار نکال کر پڑھا تو پہلے ہی صفحے پر خبر تھی کہ ہالینڈ پر غنیم نے حملہ کر دیا۔ اور آج صبح ہالینڈ کی شہزادی اپنے خاوند اور دونوں بچیوں کے ساتھ لندن آ پہنچی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد شہزادی جولیانہ بھی آگئیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کہتا تھا کہ شہزادی واپس ہالینڈ جا رہی ہیں۔ دوسرا کہتا تھا کہ نہیں شہزادہ برنارڈ واپس لڑائی پر جا رہے ہیں اور شہزادی انہیں الوداع کہنے آئی ہیں۔ ابھی مجمع کسی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا۔ کہ دروازے میں سے ایک بانکا سجیلا لیکن نہایت سنجیدہ اور متین شخص امیر البحر کی وردی پہنے داخل ہوا۔ تماشائیوں نے اس کی وجاہت اور وقار سے ایک لمحے میں اندازہ لگا لیا کہ ہمارے بادشاہ سلامت ہیں۔ اور لوگوں نے

بیساختہ ہاتھ ہلا ہلا کر اور تالیاں بجا بجا کر ان کا استقبال کیا۔ اب گویا یورپ کے دو شاہی خاندان ایک جگہ جمع تھے۔ بادشاہ سلامت بالکل میرے سامنے کھڑے شہزادی جولیانہ سے بات چیت کر رہے تھے پھر شہزادہ برنارڈ سے باتیں کرتے رہے۔ شہزادہ برنارڈ کچھ تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اور ابھی ایک سگریٹ ختم نہیں ہوتا تھا کہ اس سے دوسرا سلگا کر پینے لگتے تھے۔ ہمارے بادشاہ سلامت کی سنجیدگی اور شاہانہ وقار اتنے قریب سے آج تک میں نے نہیں دیکھا تھا۔ اتنے میں ایک چھوٹی سی ٹرین آ کر پلیٹ فارم پر ٹھہر گئی۔ ایک ڈبے میں سے دس پندرہ غیر ملکی فوجی سپاہیوں نے اتر کر بادشاہ سلامت کو سلامی دی اور بادشاہ سلامت ان کا سلام لیتے ہوئے درجہ کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے اس میں سے ہالینڈ کی بوڑھی ملکہ نکلیں جو سیدھی ہالینڈ سے لندن آ رہی تھیں۔ ہمارے بادشاہ سلامت نے شاہی دستور کے مطابق ان کے دونوں گالوں کا بوسہ لیا۔ اس کے بعد ماں بیٹیاں یعنی ہالینڈ کی ملکہ اور شاہزادی جولیانہ خوب لپٹ لپٹ کر ملیں۔ بادشاہ سلامت اور ملکہ کھڑے باتیں کرتے رہے اور ادھر شہزادی جولیانہ نے جا کر ان سپاہیوں سے ہاتھ ملائے۔ جو ان کی ماں کو اپنی حفاظت میں لائے تھے۔ شہزادی نے ایک ایک کا مزاج پوچھا اور ان سے بہت خوش ہو کر باتیں کیں۔

تھوڑی دیر بعد یہ سب دروازے سے باہر نکل گئے۔ جب بادشاہ سلامت دروازے سے واپس جانے لگے تو ایک مرتبہ پھر تمام مجمع نے اپنی وفاداری کا بیساختہ تالیاں بجا کر اظہار کیا۔ اتنے میں مجمع کئی ہزار تک پہنچ گیا تھا۔ میں نے دل میں کہا چلو چھ بجے والی گاڑی سے رہ گیا تو کیا ہوا۔ آج میں نے ایک ایسا تاریخی سین دیکھ لیا کہ جسے لوگ کئی سو سال تک یاد کریں گے۔

اوپر کی چند سطریں میں نے ۱۳ مئی ۱۹۴۰ء کی رات کو لکھی تھیں۔ اُس روز مجھے اپنی خوش قسمتی پر بہت ناز تھا کہ بادشاہ سلامت کو میں نے تقریباً دس گز کے فاصلے سے دیکھ لیا۔ لیکن میری قسمت کھڑی مسکرا رہی تھی کہ ابھی کچھ اور دیکھنا بھی باقی ہے۔ مجھے اِس بات کا سان و گمان بھی نہ تھا کہ صرف دو مہینے بعد مجھے بادشاہ سلامت اور ان کی ملکہ معظمہ کی خدمت میں بھی شرف باریابی نصیب ہوگا۔ اور میں اُنھیں قریب ہی سے نہیں دیکھوںگا۔ بلکہ ان سے ہمکلامی کا شرف بھی حاصل ہو جائے گا۔ اِسکی داستان بھی خاصی دلچسپ ہے۔

میں نے جون ۱۹۴۰ء کے آخر میں۔ بی۔ بی۔ سی کی ملازمت قبول کر لی۔ اور کیمبرج سے لندن چلا آیا۔ ۱۶ جولائی کو دوپہر کے قریب ہمیں دفتر میں اطلاع ملی کہ آج تیسرے پہر بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ بی۔ بی سی کا

ملاحظہ فرمانے کے لئے تشریف لارہے ہیں۔ اور اس دوران میں ہمارے ہندستانی محکمے کو بھی شرف باریابی حاصل ہوگا۔ ہم میں سے آج تک کسی کو بادشاہ سلامت سے شرف ملاقات نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ہم سب اس ملاقات کے بے حد مشتاق تھے۔ دو بجے سے دفتر میں تیاریاں شروع ہوگئیں۔ بی۔ بی۔ سی کی طرف سے فوجی افسروں نے آکر دفتر کی تلاشی لی آس پاس کی عمارتوں پر نظر ڈالی اور اپنا خوب اطمینان کر لیا۔ بادشاہ سلامت کی تشریف آوری بالکل غیر سرکاری اور غیر رسمی تھی۔ اس لئے دفتر میں شاہانہ استقبال کے لئے کوئی خاص تیاری نہیں ہوئی +

پانچ بجے کے قریب ہمیں اطلاع ملی کہ بادشاہ سلامت چند منٹ میں تشریف لانے والے ہیں۔ ایک فوٹوگرافر پہلے سے تصویریں لینے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اتنے میں دروازہ کھلا۔ میری میز بالکل دروازے کے سامنے ہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک بانکا سجیلا جوان فیلڈ مارشل کی وردی پہنے دروازے میں کھڑا مسکرا رہا ہے۔ یہ ہمارے بادشاہ سلامت تھے بھلا سلطنت کا کونسا باشندہ ہے جو انھیں نہیں پہچانتا۔ ان کے بالکل برابر ہماری ملکۂ معظمہ کھڑی تھیں۔ اُن کا خوبصورت اور بشاش چہرہ ہونٹوں پر مسکراہٹ، بوٹا سا قد۔ ذہین اور پُر رونق آنکھیں، سلطنت برطانیہ کے ہر باشندے کا دل موہ لیتی ہیں۔ یہ دونوں کمرے کے اندر تشریف لائے۔

ان کے ساتھ اور افسر بھی تھے۔ ہم سب تسلیم کے لئے کھڑے ہو گئے بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ نے ایک نظر میں سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ سب سے پہلے ہندستانی عملے کے سب سے بڑے افسر سر مالکم ڈارلنگ کو بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس کے بعد بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ نے فرداً فرداً ہم سب کو شرف باریابی بخشا اور ہر ایک سے ہاتھ ملایا۔ ہاتھ ملاتے وقت بادشاہ سلامت صرف مسکراتے تھے۔ اور ملکہ معظمہ ارشاد فرماتی تھیں "تم سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی" اگرچہ یہ لفظ رسمی ہیں اور انگریزی تہذیب کے مطابق ہر ایک سے ملاقات کے وقت کہے جاتے ہیں لیکن ملکہ معظمہ کی زبان پر ان میں کوئی رسمی بات نہیں پائی جاتی تھی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ واقعی اپنی ہندستانی رعایا کے چند افراد سے مل کر خوش ہیں، شرف باریابی کے بعد بادشاہ سلامت اور ملکہ معظمہ دس منٹ تک عملے سے ہمکلام رہے۔ اور ہندستان کے متعلق باتیں دریافت کرتے رہے۔ ہندستان کی زبان کے متعلق، ہندستان کے دیہات کے متعلق، ہندستان میں ریڈیو کے متعلق، غرض ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملک معظم اور ملکہ معظمہ کو ہندستان سے دلی لگاؤ ہے + میں یہ دس منٹ کبھی نہیں بھول سکتا۔ ہندستان کے چند افراد کے درمیان ہندستان کے شہنشاہ اور ان کی ملکہ کھڑے تھے۔ باہر دنیا پر

جنگ کے بادل چھا رہے تھے۔ لیکن اِس کمرے میں سکون تھا۔ راجہ خوش تھا۔ رانی خوش تھی اور ان کی خوشی دیکھ کر ان کی پرجا بھی خوش تھی ؎

لندن میں آجکل کئی ڈرامے کھیلے جا رہے ہیں۔ اپنی اپنی جگہ سب اچھے ہیں۔ لیکن جو شہرت برنارڈ شا کو ڈرامے کی دنیا میں نصیب ہے کسی اور کو اسکا عشر عشیر بھی نہیں ملا۔ دو مہینے سے برنارڈ شا کا ایک بہت پُرانا ڈرامہ The Devil's Disciple کا اسٹیج کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہجوم کا یہ عالم ہے کہ کئی کئی ہفتے پہلے سے جگہ مخصوص کرانی پڑتی ہے۔ پھر کہیں جا کر وار آتا ہے۔ یہ لڑائی کے زمانے کا ذکر ہے۔ اگر کہیں یہ کھیل امن چین کے زمانے میں ہوتا تو خدا جانے کیا حال ہوتا۔ ایک تو ڈرامہ لکھا ہوا برنارڈ شا کا۔ پھر اُس میں ہیرو کا پارٹ انگلستان کے مشہور ایکٹر رابرٹ ڈونے نے ادا کیا ہے۔ گویا سونے پر سہاگہ۔ پکے ڈلی کے پاس تھیٹر ہے۔ میں اپنے دوست احسان حیدر کے ساتھ دوپہر کا شو دیکھنے گیا۔ تماشہ ½۲ بجے شروع ہوتا ہے۔ لیکن ٹکٹ لینے والے بارہ بجے سے لین ڈوری بنائے کھڑے تھے۔ ہم بھی اُسی قطار میں کھڑے ہو گئے۔ ہجوم کا یہ عالم کہ سارے بازار میں تِل دھرنے کو جگہ نہیں۔ مگر کیا مجال جو کسی کی آواز بھی سنائی دے ہر شخص اپنی جگہ اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر ہمارا نمبر بھی آیا۔ ہم نے ٹکٹ خریدا اور کھانا کھانے پاس کے ایک رسٹوران میں چلے گئے۔ پورے

ڈھائی بجے تماشہ گھر پہنچے ہیں تو ہال تماشائیوں سے اٹا پڑا تھا۔ ہمیں اتفاق سے جگہ بالکل بیچ میں مل گئی۔ ہمارے برابر پارلیمنٹ کے ایک نوجوان ممبر بیٹھے تھے۔ یہ خود تو بالکل خاموش تھے۔ لیکن ان کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تماشے سے زیادہ ان پارلیمنٹ کے ممبر میں دلچسپی لے رہی تھی۔ اس سے خاصہ لطف رہا۔ ابھی تماشہ شروع نہیں ہوا تھا۔ میں نے اوپر کی طرف نظر اٹھائی تو خاص مہمانوں والی گیلری میں پردے کے پیچھے ایک سفید ڈاڑھی سی نظر آئی۔ روشنی ذرا کم تھی اس لئے میں نے نگاہ باندھ کر جو دیکھا تو واقعی یہ سفید ڈاڑھی ایک چہرے پر ہل رہی تھی۔ معاً مجھے خیال آیا یہ برنارڈ شا ہیں۔ میں نے اپنے دوست حیدر کو دکھایا۔ انہوں نے بھی میرے خیال کی تائید کی۔ برنارڈ شا کو اگرچہ ہم دونوں میں سے کسی نے پہلے نہیں دیکھا تھا لیکن ان کی تصویریں اور ان کے کارٹون کس نے نہیں دیکھے۔ واقعہ یہ ہے کہ برنارڈ شا بہت گوشہ نشین اور عافیت پسند مزاج کے بزرگ ہیں۔ اس لئے تماشہ شروع ہونے سے پہلے پردے میں سے جھانک رہے تھے۔ جب اندھیرا ہو کر تماشہ شروع ہوا تو پردے سے نکل کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور جب تماشے کا وقفہ آیا تو پھر غائب۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں لوگ انہیں دیکھ نہ لیں۔ پھر تو مارے تالیوں کے آسمان گونج اٹھے گا اور انہیں مجبوراً شاید تقریر بھی کرنی پڑے۔ تھوڑی دیر میں

رفتہ رفتہ سب کو برنارڈ شا کی حاضری کا علم ہوگیا اور تماشائی اوپر دیکھنے لگے۔ لیکن برنارڈ شا اسی طرح چھپ کر تماشہ دیکھتے رہے۔

۱۵ راگست ۱۹۴۰ء سے لندن پر ہوائی حملے برابر ہو رہے ہیں۔ کبھی کبھی دن کو ورنہ رات کو تو اب ایک معمول سا ہوگیا ہے کہ سورج چھپا اور جرمن ہوائی جہاز لندن پر آئے۔ شروع میں لوگوں کو دشمن کے ہوائی جہاز دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس لئے خطرے کا سائرن سننے کے باوجود بازاروں میں کھڑے ہوکر یا کھڑکیوں سے سر باہر نکال کر آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتے تھے۔ لیکن اب لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ یہ کھیل خطرناک ہے اس لئے سائرن بجنے کے دس منٹ بعد بازاروں میں سناٹا ہو جاتا ہے اور لوگ پناہ خانوں میں چھپ جاتے ہیں۔ اکسفورڈ اسٹریٹ لندن کا بہت بارونق بازار ہے۔ اور شام کو تو اس کی رونق ضرب المثل ہے۔ لیکن ان حملوں نے اب اس بازار کا روپ کھو دیا۔ خطرہ گذرنے کے بعد جب امن کا اعلان ہوتا ہے تو پھر ہجوم کا حال نہ پوچھئے۔ موٹر بسوں پر۔ زمین دوز ریلوں پر کہیں جگہ نہیں مل سکتی اس وقت ہجوم بیحد بے قابو ہو جاتا ہے اور وہ لین ڈوری باندھنے والی پرانی روایت ایک تاریخی واقعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ مجھے امن کے اعلان کے بعد کئی دفعہ زمین دوز ریلوں میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ہندستان میں کسی میلے یا عرس کے موقعہ پر جو تیسرے درجے کی حالت ہوتی ہے وہ

لندن کی ریلوں کا ایک ہلکا سا چربہ سمجھنا چاہئے۔ بس اِس سے زیادہ مجھے کہنے کی ضرورت نہیں ۔

اکثر گھروں میں اپنے بچاؤ کے پناہ خانے ہیں۔ جن گھروں میں ایسا پناہ خانہ نہیں وہ پاس کے گھر والے پناہ خانوں میں جا چھپتے ہیں۔ ورنہ ہر بازار اور ہر محلّے میں سرکاری بڑے بڑے پناہ خانے ہیں۔ اس میں سب جا سکتے ہیں۔ سورج چھپا اور بازاروں میں عورتیں اور بچّے۔ دریاں، لحاف، توشک، تکئے لئے ان پناہ خانوں میں گھستے نظر آتے ہیں۔ اور صبح سویرے اپنے گھر چلے جاتے ہیں ۔

جس مکان میں میں رہتا ہوں۔ اُس میں ایک چھوٹا سا پناہ خانہ ہے اس میں گنجائش تو چار پانچ آدمیوں کی ہے لیکن ہر روز رات کو آٹھ نو عورتیں اور بچے اس میں آکر پناہ لیتے ہیں۔ بس ایک کے اوپر ایک بیٹھ جاتا ہے۔ میں اب تک اُس پناہ خانے میں نہیں گیا تھا بلکہ رات کو اپنے ہی کمرے میں سوتا رہتا تھا۔ کل رات (۱۱ ستمبر ۱۹۴۰ء) کو اس زور کے بم گرے اور ہوا مار توپیں ایسی گرجی ہیں کہ آخر مجھے بھی پناہ لینی پڑی۔ لیکن ایک گھنٹے بعد میں وہاں نہیں ٹھہر سکا اور آکر سو گیا۔ رات بھر بم باری ہوتی رہی۔ آسمان پر دشمن کے ہوائی جہاز غرغراُڑ رہے تھے۔ ہر منٹ کے بعد بم گرنے کی دھائیں سے آواز آتی تھی۔ آسمان پر بموں کی چنگاریاں اور گولے پھٹنے کی روشنی ہو رہی تھی اور کہیں آگ

بھی لگ گئی تھی۔ اس لئے آسمان سُرخ ہو گیا تھا۔ گولوں اور بموں کے دھماکے سے مکان ہل رہا تھا۔ کھڑکیوں کے شیشے ڈر ڈر کر رہے تھے لیکن میں نے کہا جو بھی ہو مجھے تو نیند آرہی ہے۔ میں سو گیا۔ رات کو کئی دفعہ دھما کے سے آنکھ کھُلی۔ آخر صبح چھ بجے یہ قیامت کم ہوئی۔ اور اُسوقت وہ سب عورتیں اور بچے پناہ خانے سے نکل کر بستروں میں سوئے۔ یہ تو صرف ایک رات کا ذکر ہے۔ لندن میں اِن دنوں ہر رات یہی ہوتا ہے +

انگریز قوم کی ایک عجیب خاصیت ہے۔ اور وہ یہ کہ انگریزوں کے اوسان بہت کم خطا ہوتے ہیں۔ اس خاصیت کے بارے میں مجھے ذاتی تجربہ پہلے بہت کم تھا۔ لیکن اس جنگ کے دوران میں جو تجربہ مجھے ہوا وہ بہت کافی ہے۔ اور واقعی اگر اس قوم میں یہ خاصیت نہ ہوتی تو انگریز دنیا بھر کے علاقوں پر کبھی راج نہیں کر سکتے تھے۔ ہوائی حملے کے دوران میں مجھے سینما میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جب حملے کا سائرن بجتا ہے تو سینما کے پردے پر اس کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔ اگر لوگ چاہیں تو اُٹھ کر چلے جائیں لیکن مشکل سے دو چار آدمی جاتے ہیں۔ ورنہ باقی سب اسی طرح بیٹھے تماشہ دیکھتے رہتے ہیں۔ بعض دفعہ رات کے دس بج گئے۔ تماشہ ختم ہو گیا لیکن حملہ ابھی جاری ہے۔ باہر نکلنا خطرناک ہے۔ اس لئے لوگ وہیں ہال میں بیٹھے انتظار کرتے ہیں۔ اور تماشائیوں میں سے کچھ لوگ آکر اسٹیج پر گانا

بجانا شروع کر دیتے ہیں۔ کبھی ناچ شروع ہو جاتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ آس پاس بم گرنے کی آواز آرہی ہے۔ دھماکے ہو رہے ہیں۔ توپیں گرج رہی ہیں۔ لیکن تماشائیوں کو اس کی پرواہ تک نہیں۔

یہ آخری سطریں ہیں ۱۳ ؍ستمبر ۱۹۴۰ء کو لندن سے لکھ رہا ہوں۔ اسوقت لنڈن پر دشمن کے ہوائی جہاز آرہے ہیں لیکن مجھ سے بہت دور ہیں۔ کبھی کبھی بہت دور سے بموں کے دھماکے سنائی دیتے ہیں۔ بازار میں خاموشی ہے۔ کبھی کبھی آگ بجھانے کا انجن زن سے گذر جاتا ہے۔ جب ہوائی خطرہ ختم ہو جائیگا تو میں اس مضمون کو ڈاک میں ڈالوں گا۔ دیکھئے کب ہندستان پہنچتا ہے اور کب چھپنے کی نوبت آتی ہے اور خدا جانے اُسوقت دنیا کا کیا حال ہوتا ہے۔ بہرحال بعض دفعہ پُرانی باتیں پڑھ کر بھی لطف آتا ہے اگر دنیا بدل گئی تو یہ مضمون ایک افسانہ بن جائیگا۔ ورنہ میری ذاتی یادداشت رہے گا۔ جب میرے احباب شاید مزے لے لے کر پڑھیں۔

چو باحبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر حریفان بادہ پیما را

۱۳ ؍ستمبر ۱۹۴۰ء

لندن میں اردو

مجھے انگلستان پہنچے بمشکل سے چار مہینے ہوئے ہیں اور ابھی تک لندن جیسے بڑے شہر کو پوری طرح دیکھنے کا بھی موقع نہیں ملا اس لئے میں لندن میں اُردو کے متعلق بہت زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ تاہم خوش قسمتی سے مجھے جن جن صحبتوں میں شرکت کا اتفاق ہوا ہے اُن کے ذکر سے اپنے ہموطنوں کو محروم نہیں رکھنا چاہتا۔ جنگ کی وجہ سے میرا جہاز سوئیز کے راستے کی بجائے جنوبی افریقہ کا چکر کاٹ کر آیا۔ اس راستہ بدلنے سے مجھے اور میرے عزیزوں کو جو تکلیف ہوئی اسکا نعم البدل یہ ملا کہ جنوبی افریقہ کے سب سے مشہور شہر کیپ ٹاؤن کو دیکھنے کا موقع مل گیا۔ وہاں مجھے سب سے زیادہ خوشی یہ دیکھ کر ہوئی کہ ہندستانیوں کے ساتھ ہماری زبان اس علاقے میں بھی پہنچ گئی۔ جنوبی افریقہ میں ہر چند کہ ہندستانیوں کے ساتھ ہمدردانہ اور برابر کا سلوک نہیں ہوتا لیکن ان مشکلات کے باوجود بہت سے ہندستانی وہاں کے کاروبار میں نمایاں ہیں اور ان کی سب

حلقوں میں نہایت عزت کی جاتی ہے۔ یہ لوگ اگرچہ ہندستان کے مختلف حصوں سے آئے ہیں لیکن آپس میں اُردو میں بات چیت کرتے ہیں۔ اور خوشی اس بات کی ہے کہ ان کی اولاد افریقہ میں تربیت پانے کے باوجود ہندستان کی زبان نہیں بھولی۔ جنوبی افریقہ کے علاوہ مجھے مغربی افریقہ میں فری ٹاؤن کی بندرگاہ پر اُترنے کا بھی اتفاق ہوا۔ وہاں بھی بہت سے ہندستانی تاجروں کے ساتھ اُردو زبان پہنچ گئی ہے +

انگلستان پہنچنے کے بعد مجھے یقین تھا کہ چند روز تک غالباً مجھے اُردو زبان سُننے کا موقع نہیں ملے گا۔ کیونکہ لندن یونیورسٹی بند تھی اور میرے شاگرد چھٹیوں سے واپس نہیں آئے تھے۔ لیکن اتفاق دیکھئے کہ ۷ اکتوبر سنہ ۳۹ء کو صبح سات بجے جب میری ٹرین لندن پہنچی اور میں اسٹیشن سے سیدھا ایک ہوٹل گیا تو ہوٹل کے ملاقات والے کمرے میں ایک بزرگ عبا پہنے تسبیح ہاتھ میں لئے ٹہلتے نظر آئے۔ صبح کی روشنی میں اور ذرا غور سے دیکھا تو ان کے سر پر چھوٹی سی ترکی ٹوپی اور مُنہ پر ڈاڑھی بھی نظر آئی میں نے اپنی آنکھیں ملیں کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ ہوٹل کے ملازم ابھی سب سو رہے تھے۔ اور کمرے میں کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا۔ اس لئے مجھے اور بھی شبہ ہوا۔ ابھی میں ان بزرگ کی شخصیت کے متعلق فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہ انہوں نے نہایت مدھم آواز میں گُڈ مارننگ کہا: اب میں

زیادہ تاب نہیں لا سکا۔ بے صبری سے بولا کہ "قبلہ میں ہندستانی ہوں، آپ بھی ہندستانی ہیں۔ مجھ سے اردو میں بات کیجئے۔" پھر تو وہ بزرگ بیحد خوش ہوئے۔ اب جو میں نے اور قریب بڑھ کر مصافحہ کیا تو صورت آشنا نظر آئے لیکن ذہن نے نام بتانے میں مدد نہ دی۔ آخر انہوں نے خود فرمایا کہ "میرا نام حسرت موہانی ہے۔"

اللہ اللہ یہ ہندستان کے لیڈر، اور اردو کے مشہور شاعر حسرت موہانی تھے کہ جن سے میں باتیں کر رہا تھا۔ میری خوش قسمتی دیکھئے کہ لندن میں سب سے پہلے ملاقات بھی ہوئی تو اردو کے اس جلیل القدر ادیب سے۔ خیر یہ تو ایک ضمناً واقعہ تھا۔ میں لندن سے سیدھا کیمبرج چلا آیا۔ کیونکہ لندن یونیورسٹی اٹھ کر ان دنوں مستقل طور پر کیمبرج چلی آئی ہے۔ کیمبرج میں ہندستانی طلباء کو دیکھا لیکن انگریزیت کے اثر میں۔ حد یہ ہے کہ ہمارا کالج بھی اگرچہ مشرق کے علوم کا گہوارہ ہے لیکن اردو پڑھانے کے علاوہ کوئی اور اردو کی صورت نظر نہ آئی۔ آخر میں نے چند ادب شناسوں کو ایک جگہ جمع کر کے یکم دسمبر ۳۹ء کی شام کو ایک جلسہ کیا۔ اس جلسے میں ہندوستانیوں کے علاوہ بہت سے انگریز بھی آئے تھے۔ یہ سب اردو سمجھتے تھے اور بول بھی سکتے تھے۔ اس کی صدارت مسٹر اکرام اللہ آئی۔ سی۔ ایس نے کی۔ شروع میں میں نے جلسہ کے اغراض و مقاصد

بیان کئے اور پھر اُردو شاعری پر ایک مضمون پڑھا۔ بعد میں قرار پایا کہ کیمبرج میں اُردو زبان کی ترویج کے لئے ایک انجمن قایم کی جائے۔ چنانچہ اب تک اس انجمن کے دو جلسے ہو چکے ہیں۔ اور اب کرسمس کی چھٹیوں کے بعد پھر جلسے ہونے لگیں گے۔

کرسمس کے موقع پر مجھے لندن جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں سر عبدالقادر مدظلہ نے ایک ہندستانی یونین کی بنیاد رکھی تھی جس کے معرکتہ الآرا جلسوں کی یاد اب تک سب کے دل میں باقی ہے۔ اسی یونین کے جلسوں میں حفیظ جالندھری کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ جن کی دھوم ہم تک ہندستان میں بھی پہنچ چکی ہے۔ اب اس انجمن کے صدر سر حسان سہروردی ہیں۔ سر حسان نے ہندستانی یونین کے ممبروں کو ۲۱۔ دسمبر ۲۹ء کو نہایت شاندار دعوت دی۔ اس دعوت میں بہت سی نظمیں اور غزلیں پڑھی گئیں چونکہ یونین کے سکریٹری دیوان شرر صاحب ہندستان چلے گئے ہیں اسلئے مجھے سکریٹری منتخب کیا گیا۔ ہندستانی یونین کا دوسرا جلسہ ۳۱ دسمبر کی شام کو اورسیز لیگ کے ہال میں ہوا۔ یونین کی نہ زور ممبر بیگم اکرام اللہ صاحبہ ہندستان تشریف لے جا رہی تھیں، ان کے اعزاز میں پروفیسر ڈی۔ ورما نے دعوت دی۔ بیگم صاحبہ کا تعارف اسقدر کافی ہے کہ لندن یونیورسٹی میں اُردو ناول نگاروں پر محققانہ مقالہ لکھ رہی ہیں۔ اور ماڈرد

ادب کی مدّاح ہیں۔ ہندستانی یونین کی تو بس انھیں جان سمجھنا چاہئے۔ اس موقع پر محسن میرزا صاحب دہلوی نے فی البدیہہ چند شعر بیگم اکرام اللہ کے متعلق سنائے جو نقل کرتا ہوں:۔

اکرام کی بیگم ہیں جو یہ بول رہی ہیں
غنچے کی طرح باغ میں منہ کھول رہی ہیں
ہم بولنے والوں میں یہ انمول رہی ہیں
آمادۂ پرواز ہیں پر تول رہی ہیں
آراستہ کرنے کے لئے بزم سخن کو
بنگالے کی مینا ہیں جو جاتی ہیں چمن کو

اسی جلسے میں سر حسان سہروردی نے حضرت اکبر کے چند غیر مطبوعہ اشعار بھی سنائے جو اکبر الہ آبادی نے سر حسان کے متعلق کہے تھے۔ یونین کے ان دونوں جلسوں میں بہت سے ہندستانی شریک ہوئے اور ان کے ساتھ متعدد انگریز مرد اور خواتین بھی آئیں جنہیں اُردو سے دلچسپی ہے۔ اور اُردو سیکھ رہی ہیں۔ ہندستانی یونین کا آئندہ جلسہ ۲۸ جنوری ۱۹۳۰ء کو لندن میں ہونا قرار پایا ہے۔

ہندستانی یونین کے علاوہ لندن میں ایک ہندستانی مجلس بھی ہے مجھے اس میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن سنا ہے اس کے جلسے بھی بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔

لندن میں اُردو کا تذکرہ اسوقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ

لندن یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے صدر ڈاکٹر گراہم بیلی کا ذکر نہ کروں ہندستان میں ڈاکٹر بیلی کو بہت سے لوگ اُردو زبان کی انگریزی میں تاریخ کے مصنّف کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن ان سے ملنے کا بہت کم ہندستانیوں کو اتفاق ہوا ہوگا۔

ڈاکٹر بیلی اُردو اس قدر فصاحت اور روانی سے بولتے ہیں کہ اگر انھیں پردے کے پیچھے بٹھا دیا جائے تو کوئی تمیز نہیں کرسکتا کہ یہ انگریز ہیں۔ پھر ان کی زبان بے حد صحیح اور بامحاورہ ہے۔ تلفظ کی صحت کا بہت خیال ہے۔ اُردو کے علاوہ ڈاکٹر بیلی پنجابی بھی بہت عمدہ بولتے ہیں۔ بلکہ یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ یہ اُردو بہتر بولتے ہیں یا پنجابی۔

اسی سلسلے میں غالباً یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک روز سی۔ پی کے سابق گورنر اور وزیر اعظم ڈاکٹر رگھو وندر راؤ جو آجکل لندن میں وزیر ہند کے مشیر ہیں، مجھے اپنے مکان پر لے گئے۔ ان کے کمرے میں سب سے پہلے میری نظر اُردو کے قاعدے پر پڑی میں نے تعجب سے پوچھا یہ کیا۔ جواب دیا اُردو کا شوق ہے۔ آجکل پڑھ رہا ہوں۔ میں نے کہا تو پھر بسم اللہ۔ چنانچہ دس روز کے اندر اب ڈاکٹر راؤ اُردو رسم الخط لکھنے اور پڑھنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اور اگر یہ مشق اسی طرح قایم رہی تو چند روز میں کتابیں آسانی سے پڑھ سکیں گے۔

اب بھی یہ کہنا ظلم ہے کہ اُردو سیکھنا دشوار ہے۔

آپ کو اِن چند سطروں سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ سمندر پار کے ملکوں میں بھی اُردو کی دُھوم ہے۔ اور اقبالؔ نے یہ بالکل دُرست کہا ہے ؎

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو ہمیں وہیں تم دل ہو جہاں ہمارا

یکم جنوری ۱۹۴۰ء

ڈاکٹر گراہم بیلی

جون ۱۹۳۹ء میں لندن یونیورسٹی نے مجھے اُردو کا لکچرار مقرر کیا، اور اس کے چند روز بعد ہندستان ہی میں مجھے ایک دن ڈاکٹر گراہم بیلی کا خط ملا۔ ڈاکٹر بیلی نے یہ خط مجھے لندن سے لکھا تھا اور میرے تقرّر پر مجھے مبارکباد دی تھی۔ اس سے پہلے میں نے ان کا نام تو ضرور سنا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ لندن میں مجھے اُن کے ماتحت کام کرنا پڑیگا۔ مگر سچ پوچھئے تو میں اپنے دل میں یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ جس طرح عام طور سے انگریز ہندستانی زبان کی دو چار کتابیں پڑھ کر ٹوٹی پھوٹی اُردو لکھ پڑھ لیتے ہیں اور دو چار غلط سلط جُملے بول لیتے ہیں، یہی حال ڈاکٹر بیلی کا بھی ہوگا لیکن ان کے خط نے مجھے چونکا سا دیا۔ یہ خط آج بھی میرے سامنے رکھا ہے اور اب بھی جب کبھی میں یہ خط دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی رائے پر شرم آتی ہے۔ انہوں نے مجھے خط تو انگریزی میں لکھا تھا۔ مگر اس میں دو چار باتیں ایسے پتے کی تھیں کہ اُنھیں پڑھتے ہی میری آنکھیں کُھل گئیں۔ اور ڈاکٹر

بیلی کے متعلق مجھے اپنی رائے بدلنی پڑی۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا:۔

"جب آپ لندن آئیں گے تو میں آپ سے ہندی اور اُردو گرامر کے چند قاعدوں کے بارے میں بحث کرونگا۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں کہ ان کے متعلق اب تک کوئی عام قاعدہ نہیں بن سکا۔ مثلاً "کو" علامتِ مفعول ہے۔ مگر کبھی "کو" استعمال کرتے ہیں اور کبھی نہیں کرتے۔ بعض لفظوں کے ساتھ "کو" کبھی استعمال نہیں کیا جاتا۔ جھوٹ بولنا۔ مار کھانا۔ بے عزت کرنا تو سب بولتے ہیں لیکن جھوٹ کو بولنا۔ مار کو کھانا۔ بے عزتی کو کرنا کبھی نہیں سُنا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ اور غیر زبان داں کس قاعدے پر چل سکتے ہیں"۔

اس کے بعد ڈاکٹر بیلی نے ہندستان ہی میں مجھے اپنے ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھیجا۔ اور اس میں سے چند مضمون پڑھنے کی مجھے خاص طور سے ہدایت کی۔ یہ مضمون پڑھ کر میں ان کی زبان دانی کا نہیں تو کم از کم ان کی تحقیق اور ان کے ادبی انہماک کا ضرور قائل ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۳۹ء میں میں لندن پہنچا۔ چونکہ ہمارا کالج لڑائی کی وجہ سے کیمبرج چلا گیا تھا۔ اس لئے میں بھی سیدھا لندن سے کیمبرج پہنچ گیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بیلی ابھی تک کیمبرج نہیں آئے۔ آٹھ دن بعد آئیں گے۔

یہ ایک ہفتہ میں نے بہت بے چینی سے گذارا۔ کیونکہ اُن سے ملاقات کا اشتیاق بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ آخر ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ کل صبح کے دس بجے فلاں کمرے میں میری اُن سے ملاقات ہوگی۔ دوسرے دن وقت سے پہلے ہی میں اُس کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اِدھر کالج کے گھنٹے نے ٹن ٹن دس بجائے اور اُدھر کمرے کا دروازہ کھلا۔ نکلتا ہوا قد، بھرا ہوا جسم، سرخ و سفید چہرہ، سفید بڑی بڑی مونچھیں، چھوٹے شیشوں کی عینک۔ پُرانی وضع کا چھوٹا سخت سفید کالر۔ ساٹھ ستّر سال کے قریب عمر۔ گلے میں گیس کی ٹوپی کا بکس، ہاتھ میں موٹی سی لکڑی۔ ایک نظر میں ان کا یہ حُلیہ میرے ذہن میں اُتر گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹوپی اُتاری اور میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے انگریزی میں گُڈ مارننگ کہا۔ مگر میرے سلام کا جواب انہوں نے نہایت صاف اُردو زبان میں دیا۔ ان کا پہلا جُملہ میں کبھی نہیں بھول سکتا "آخر آپ ولایت پہنچ گئے۔ میں تو سمجھا تھا کہ ہمارے اشرف صاحب لڑائی کی وجہ سے نہیں آسکینگے"۔ میرے کانوں کو یقین نہیں آیا۔ میں کیسے مان سکتا تھا کہ کیمبرج میں بھی ایسی صحیح زبان سُننے میں آسکتی ہے۔ اپنا شک دور کرنے کے لئے میں نے اُن سے کچھ اُردو میں کہا۔ اور اس کا جواب ڈاکٹر بیلی نے پھر بامحاورہ اور صحیح زبان میں دیا۔ پھر تو ہم دونوں آتشدان کے سامنے کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے اور پہلی ہی ملاقات میں ایسی گھُل کر باتیں

ہوئیں جیسے برسوں کی دوستی ہو +

ایک بات کا اندازہ میں نے چند منٹ میں کر لیا۔ وہ یہ کہ اگرچہ ڈاکٹر بیلی اور مجھ میں تیس چالیس سال کا فرق تھا۔ مگر اِن کا برتاؤ مجھ سے بالکل برابر والوں جیسا تھا۔ کوئی ڈھائی تین گھنٹے تک ہم بیٹھے دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے۔ بیچ میں یہ مجھ سے اکثر یہ بھی کہتے جاتے تھے۔ ابھی آپ نے اِس لفظ کا تلفظ یوں ادا کیا ہے۔ میرے ایک شاگرد حیدر آباد دکن سے آئے تھے وہ تو اسے یوں بولتے تھے۔ ایک صاحب یو۔پی کے رہنے والے تھے ان کا تلفظ یہ تھا۔ اور ڈپٹی نذیر احمد کو میں نے یوں بولتے سُنا ہے۔ مجھے ان کی یادداشت پر بہت تعجب ہوا۔ ایک بجے کے قریب کھانے کا وقت آیا تو جیب سے گھڑی نکال کر بولے۔ اب مجھے اپنے گھر جانا چاہیئے۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ ڈاکٹر بیلی کی زبان سے کیمبرج میں "وہ" کا لفظ سُن کر مجھے ہندستان یاد آگیا۔ اِس کے بعد بھی جب کبھی انہوں نے اپنی بیوی کا ذکر کیا ہمیشہ ان کے متعلق "وہ" کا لفظ ہی استعمال کیا۔

اکثر باتوں میں ڈاکٹر بیلی پر مشرقیت کا اثر بہت غالب تھا۔ اور اُردو بولتے وقت تو ہمیشہ سید انشاء کا یہ مقولہ یاد رکھتے تھے کہ جو لفظ اُردو میں آگیا اسکا تلفظ اُردو ہی کے لحاظ سے کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اپنی گفتگو میں

پلیٹ فارم۔ پوسٹ کارڈ۔ اسکول اور اسٹول وغیرہ لفظ ہمیشہ ہندستانیوں کی طرح ادا کرتے تھے۔

ایک سال تک مجھے ڈاکٹر بیلی کے ساتھ کیمبرج میں اُردو اور ہندی پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ اور ان سے میں نے ہندی کی دو چار کتابیں پڑھیں گھنٹوں اُن سے علمی اور ادبی باتوں پر بحث بھی کی۔ اور ہمیشہ میں نے یہی محسوس کیا کہ ڈاکٹر بیلی کو ہندی اور اُردو ادب سے حقیقی معنوں میں دلچسپی تھی۔ یہ زبان کو زبان سمجھ کر پڑھتے تھے۔ اور اس کا لطف بھی اٹھاتے تھے۔ انھیں ہر محاورے کی سند یاد تھی۔ ان کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ ہر بات کی سند میں اساتذہ کے شعر یا مستند ادیبوں کے فقرے کے فقرے نقل کر دیتے تھے۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ جو بہت کم ہندستانیوں کو نصیب ہوگی۔ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادب پر انھیں پورا عبور حاصل تھا۔ دونوں زبانوں کے مصنفوں اور شاعروں کی تصانیف ان کی نظر میں تھیں۔ اور اب تک جتنی اچھی اچھی کتابیں ہندستان میں چھپی تھیں یہ انھیں پڑھ چکے تھے۔

ایک سال تک برابر تقریباً ہر روز میری اُن سے دو تین گھنٹے تک ملاقات ہوتی رہی۔ اور ایک بات پر مجھے بیحد تعجب ہوا۔ سنہ ۳۹ء اور سنہ ۴۰ء میں لڑائی کی حالت بہت نازک ہوگئی۔ فرانس نے

ہتھیار ڈال دیئے۔ ہر شخص کی زبان پر جنگ کا ذکر تھا۔ مگر ڈاکٹر بیلی نے کبھی مجھ سے لڑائی کا ذکر نہیں کیا۔ جس دن فرانس نے ہتھیار ڈالے ہیں اُس روز اُن کے چہرے پر ایک حد تک پریشانی کے آثار ضرور تھے۔ مگر ٹھیک دس بجے آن کر انہوں نے پھر وہی تذکیر و تانیث، محاوروں اور افعال پر بحث شروع کر دی۔ اگست ۱۹۴۰ء میں جب لندن پر زبردست بمباری شروع ہوئی تو ایک دن تیسرے پہر یہ مجھ سے ملنے کے لئے بی۔بی۔سی میں آئے۔ ایکا ایکی ہوائی حملے کے سائرن بجنے لگے۔ ہم سب پناہ خانے میں چلے گئے۔ دُور سے بموں کی دہشتناک آوازیں چلی آتی تھیں۔ سب لوگ بموں کا ذکر کر رہے تھے۔ مگر ڈاکٹر بیلی نے مجھ سے پوچھا کہ بم گرنے سے کھڑکیوں میں جو آواز پیدا ہوتی ہے اُسے آپ کیا کہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ بم کے دھماکے سے کھڑکیاں جھنجھنا اٹھتی ہیں۔ اِس کے بعد جب تک ہم پناہ خانے میں بیٹھے رہے یہ برابر زبان کے متعلق ہی مجھ سے باتیں پوچھتے رہے۔

ڈاکٹر بیلی نے آخری زمانے میں اردو پڑھانے کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔ اور میں اِسے اپنے لئے بہت بڑا فخر سمجھتا ہوں کہ اپنے چالیس پچاس برس کے تجربے کا نچوڑ انہوں نے میرے حوالے کر دیا تاکہ میں اس کی نظرثانی کروں۔ اس کے ایک ایک لفظ کو ہم

دونوں نے بیٹھ کر جانچا۔ اِن کے بتائے ہوئے قاعدوں پر بحث کی۔ ان کے جُملے کے جُملے بدل دئیے۔ کچھ باتوں میں مجھے ان کی رائے سے اتفاق نہیں ہوا۔ اور میں نے صاف صاف اُن سے کہہ بھی دیا۔ مگر اُنہیں اس بات کا کبھی رنج نہیں ہوا۔ بلکہ ہمیشہ یہ اپنی غلطی نہایت خندہ پیشانی سے مان لیتے تھے۔ اور میرے نزدیک "طالب علم" کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ یہ آخر دم تک علم کی تلاش کرتا ہے اور دوسروں سے کوئی نئی بات سیکھنا عار نہ سمجھے۔ اِسقدر علم اور فضیلت کے باوجود یہ بچوں کی طرح کھود کھود کر باتیں پوچھتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی اسی جرح سے زبان کے بہت سے نکتے میری سمجھ میں آ گئے۔ اور میں نے بہت کچھ ان کے سوالوں سے سیکھ لیا۔

اگست ۱۹۳۸ء میں بیس سال تک لندن یونیورسٹی میں اُردو پڑھانے کے بعد ڈاکٹر بیلی نے پنشن لے لی۔ گذشتہ دس پندرہ سال سے سرکار نظام کی طرف سے لندن یونیورسٹی میں نظام ریڈر آف اُردو کی تنخواہ ملتی تھی اور اس عہدے پر ڈاکٹر بیلی ممتاز تھے۔ پنشن لینے کے بعد بھی یونیورسٹی نے انہیں اعزازی طور سے اِسی عہدے پر قایم رکھا۔ لندن سے یہ اڈنبرا چلے گئے۔ مگر وہاں بھی زبان کا شوق باقی رہا۔ آخر تک میری ان سے خط و کتابت جاری تھی۔ اور

ہر خط میں یہ محاوروں، افعال، اور بندشوں کے متعلق مجھ سے بہت باریک باریک باتیں پوچھا کرتے تھے۔ مرنے سے چند ہفتے پہلے انہوں نے چار صفحے کے خط میں کوئی سو ڈیڑھ سو محاورے مجھے لکھ کر بھیجے تھے اور دریافت کیا تھا کہ ان میں کیا کیا فرق ہے۔

میری درخواست پر ڈاکٹر بیلی نے بی۔بی۔سی کے لئے چھ تقریریں ہندستانی زبان میں لکھی تھیں اور خوش قسمتی سے میں نے ان کا ریکارڈ بنالیا تھا۔ یہ سب تقریریں انہوں نے خود لکھی تھیں۔ البتہ کہیں کہیں مجھ سے مشورہ لیا تھا۔ یہ تقریریں ہندستان میں بہت سے لوگوں نے ریڈیو پر سنی ہوں گی۔ اور اندازہ لگالیا ہوگا کہ زبان پر انھیں کس قدر قدرت تھی۔ عام طور سے انگریز غ، ق، ڑ وغیرہ حروف کا تلفظ نہیں کرسکتے۔ مگر ڈاکٹر بیلی کو میں نے یہ غلطی کرتے نہیں سنا۔ چونکہ یہ ایک مدت تک پنجاب میں رہے تھے اس لئے قدرتی طور پر ان کی زبان پر پنجاب کا اثر تھا۔ اگر پردے کے پیچھے سے یہ بولتے تو سننے والا یہی سمجھتا کہ کوئی پنجابی بیٹھا اردو بول رہا ہے۔ ڈاکٹر بیلی نے مجھ سے خود بیان کیا کہ ایک دفعہ پنجاب کے کسی گاؤں میں یہ جا رہے تھے۔ کہ رات ہوگئی۔ رات کے اندھیرے میں یہ راستہ بھول گئے دور سے روشنی دیکھ کر یہ اس طرف چلے۔ قریب جاکر دیکھا تو چار پانچ دیہاتی

آگ کے چاروں طرف بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ اُنہوں نے جاکر پنجابی میں اُن سے راستہ پوچھا۔ رات کے اندھیرے کی وجہ سے وہ اِنہیں دیکھ نہیں سکتے تھے۔ اِس لئے یہی سمجھے کہ کوئی راستہ بھُول گیا ہے چنانچہ گاؤں والوں نے اُنھیں اپنے ہاں رہنے کی دعوت دے دی۔ اور پوچھا تمہارا نام کیا ہے۔ اُنہوں نے وہیں دُور سے کھڑے کہا: "بیلی"۔ پنجاب میں عام طور سے بیلی رام نام رکھا جاتا ہے۔ اِسلئے گاؤں والے اب بھی اِنھیں پنجابی سمجھتے رہے۔ ڈاکٹر بیلی کہا کرتے تھے۔ اِس بات کا مجھے بہت لطف آیا۔

میں نے اُنھیں پنجابی بولتے بھی سُنا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اِن جیسی پنجابی شاید ہی کوئی اور غیر پنجابی بول سکتا ہوگا۔ جوانی کے زمانے میں یہ پادری کی حیثیت سے ہندستان گئے تھے۔ اور ایک مدت تک پنجاب کے علاقے میں اسکول میں پڑھاتے رہے چھٹیوں کے زمانے میں ہمیشہ پہاڑوں کا دورہ کرتے تھے۔ اور اِس طرح انہوں نے تبتی، نیپالی، کشتواڑی اور علاقہ دردکی زبانیں بھی سیکھ لیں فارسی اور سنسکرت سے بھی انہیں شُدبُد ہوگئی۔ ان زبانوں کے متعلق انہوں نے سب ملاکر سولہ کتابیں لکھیں۔ اِس کے علاوہ انگریزی کے اخباروں اور رسالوں میں بھی ہندُستانی زبانوں پر بہت دلچسپ

مضمون لکھتے رہتے تھے +

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے ڈاکٹر گلکرسٹ کے بعد انگریزوں میں ہندستانی زبان کی خدمت سب سے زیادہ ڈاکٹر گراہم بیلی نے کی ہے۔ خوش قسمتی سے ڈاکٹر گلکرسٹ کو میر امّن، میر شیر علی افسوس، مظہر علی ولا اور للوجی لال جیسے ادیب مددگار کی حیثیت سے مل گئے۔ ڈاکٹر بیلی کو یہ بات نصیب نہیں ہو سکی۔ اسلئے ان کا نام شاید اُردو ادب میں زندہ نہ رہ سکے، مگر اتنا میں جانتا ہوں کہ ان کے دم سے لندن یونیورسٹی میں اُردو اور ہندی کا نام زندہ تھا۔ اور اب اِن کی کرسی ایسی خالی ہوئی ہے کہ اس پر بیٹھنے کے لئے ایسا موزوں شخص مشکل سے ہی ملے گا +

اپریل سنہ ۴۲ء

کیمبرج میں ہندوستانی طالب علم

کسی زمانے میں دہلی اور لکھنؤ ہندوستان کی زبان اور تہذیب کے مرکز سمجھے جاتے تھے۔ آجکل یہی رتبہ انگلستان میں کیمبرج اور آکسفورڈ کو حاصل ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تہذیب و تمدن کسی شہر کے اینٹ اور پتھر کی تاثیر نہیں۔ جہاں اہلِ کمال جمع ہونگے وہیں سے یہ پھول کھلنے لگیں گے۔ چنانچہ کیمبرج کے شہر کو دیکھئے تو انگلستان میں اس جیسے سینکڑوں چھوٹے بڑے قصبے اور شہر ملیں گے۔ لیکن آٹھ سو سال سے جو دھاک کیمبرج کے عالموں اور فاضل طالب علموں نے دنیا پر بٹھا رکھی ہے اس کا جواب اس زمانے میں کہیں اور شاید ہی مل سکے۔

کیمبرج یونیورسٹی کے نام سے کون پڑھا لکھا ناواقف ہوگا۔ آجکل جس شخص کے نام کے ساتھ کینٹب کا لفظ لکھا ہو یہ سند اس بات کی ہے کہ اس نام کا مالک اپنی علمی فضیلت اور ادب قاعدے کے اعتبار سے

ایک خاص وقعت کا حقدار ہے۔ پہلے میں آپ کو کیمبرج کی سیر کراتا ہوں اس کے بعد یہاں کے ہندستانی طالب علموں کی زندگی کا حال سناؤنگا۔

کہنے کو تو کیمبرج ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ لیکن علمی دُنیا میں اس کی شہرت نہ دریائے کیم، کی وجہ سے ہے، کہ جس کے کنارے یہ شہر آباد ہے، نہ یہ اُن خوبصورت چراگاہوں اور ہرے بھرے خیابانوں کی وجہ سے مشہور ہے کہ جو شہر کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں بلکہ اس کی شُہرت کا تمامتر راز یونیورسٹی کے نام میں مضمر ہے۔ لیکن کیمبرج آکر آپ کسی سے یونیورسٹی کا پتہ پوچھئے تو شاید ہی کوئی آپ کے سوال کا جواب دے۔ کیونکہ کیمبرج یونیورسٹی عبارت ہے اُن کالجوں سے جو اس شہر میں جا بجا کھڑے زبانِ حال سے اپنی عظمت اور تاریخی وقار کا ڈنکا بجا رہے ہیں۔ کیمبرج میں اس وقت سترہ کالج یونیورسٹی سے ملحق ہیں۔ جن میں سب سے پُرانا پیٹرہاؤس تیرھویں صدی کے آخر میں بنا تھا۔ اور سب سے نیا ڈاؤننگ کالج ۱۸۰۰ء میں تیار ہوا۔ باقی کے سب کالج اس سات سو سال کے اندر بنے ہیں۔ اور ہر کالج کی زندگی اور روایات، گویا کیمبرج کی تاریخ کا ایک ایک باب ہیں، کہ جن سب کے مجموعے کا نام کیمبرج یونیورسٹی ہے۔

ہر کالج کا نظم و نسق پرنسپل کے ہاتھ میں ہے۔ جسے یہاں کی زبان

ہیں ماسٹر کہتے ہیں۔ یونیورسٹی کا مجموعی طور پر انتظام چانسلر کے سپرد ہے
اور اس عہدے پر ان دنوں انگلستان کے سابق وزیر اعظم لارڈ بالڈون
مامور ہیں۔ لیکن چانسلر کا عہدہ صرف اعزازی سمجھا جاتا ہے۔ فی الحقیقت
یونیورسٹی کے کاروبار کی نگرانی وائس چانسلر کرتا ہے۔ جو کالجوں کے
پرنسپل آپس میں کسی ایک کو چن لیتے ہیں۔

کالج کا خرچ اپنے سرمائے اور فیسوں کی آمدنی سے چلتا ہے۔ ہر
کالج کے نام پر صدیوں سے لاکھوں پونڈ کی جائداد۔ زمین یا گاؤں وغیرہ
وقف ہیں۔ اور اسی آمدنی کے سہارے کالج چل رہے ہیں۔ اس کے
علاوہ یونیورسٹی کو ہر سال سرکار کی طرف سے بہت کافی گرانٹ بھی
ملتی ہے۔ ہندوستانی کالجوں کی طرح ہر کالج میں پرنسپل کے ماتحت
بہت سے اُستاد رکھے جاتے ہیں۔ کیمبرج میں ان استادوں کو فیلو
کہتے ہیں۔ ان میں سے ایک یا دو فیلو لڑکوں کے ٹیوٹر یعنی اتالیق
مقرر ہیں۔ اور یہاں اتالیق کا وہی منصب ہے جو گھر پر ماں باپ
کا ہوتا ہے۔ لڑکوں کی نگرانی، ان کی تعلیم کا خیال، ضابطے کی پابندی
اور ڈانٹ ڈپٹ کا تلخ فرض ٹیوٹر کے سپرد ہے۔ اس لئے عام طور پر
لڑکے یونیورسٹی میں یا تو ٹیوٹر سے ڈرتے ہیں، یا اپنے کالج کے
دربان سے۔

تقریباً آٹھ سو سال سے کیمبرج کی روایات قایم ہیں۔ اور ہر طالب علم کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اِن قدیم روایتوں پر کاربند ہو کر اپنی انفرادیت کو یونیورسٹی کی زندگی میں مدغم کر دے۔ اگر بفرضِ محال کوئی منچلا اپنی ذاتی اُپج کی بنا پر اِن روایتوں کو توڑنا بھی چاہے تو یونیورسٹی کے قانون اور دوسرے طالب علم اُسے آزاد ہونے نہیں دیتے۔ اور اس کی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ اس لئے ہر طالب علم اپنی انفرادی طبیعت کے باوجود اپنے آپ کو یہاں کی زندگی کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے اور یہی کیمبرج کی سب سے قدیم روایت بھی ہے۔

انگلستان کے تعلیمی نظام کے مطابق سکول ختم کرنے کے بعد تین سال میں بی۔ اے کی ڈگری ملتی ہے۔ گویا ہر طالب علم کو کم از کم تین سال تک یونیورسٹی میں رہنا پڑتا ہے۔ البتہ ہندستان کے گریجویٹ طالب علموں کے لئے یہ تین سال کی مدت صرف دو سال بھی ہو سکتی ہے۔ دستور کے مطابق یونیورسٹی کی زندگی کا پہلا سال کالج کے بورڈنگ ہاؤس میں نہیں بلکہ شہر کے کسی مستند گھر میں گذارا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طالب علموں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ان کے رہنے سہنے کا خاطر خواہ انتظام کالجوں میں نہیں ہو سکا۔ لیکن یہ نہ سمجھئے کہ کالج سے باہر رہ کر لڑکے بورڈنگ کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتے ہیں۔

تو یہ کیجئے۔ یونیورسٹی کے قاعدے قانون اسقدر سخت ہیں کہ ان سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اول تو آپ کے لئے شہر میں گھر کالج والے ڈھونڈیں گے۔ پھر اس گھر کی مالکہ سے کہ جسے کیمبرج میں لینڈ لیڈی کہتے ہیں اسقدر رکڑی شرطیں کی جاتی ہیں کہ یہ آپ پر ماں باپ سے زیادہ نگرانی کرتی ہے۔ مثلاً کالج کا قانون ہے کہ رات کو دس بجے سے پہلے اپنے اپنے کمرے پر پہنچ جائیے۔ اس کے بعد آنے پر ڈو آنے جرمانہ ہوتا ہے۔ اگر آپ کالج میں رہتے ہیں تو دیر میں آنے کی رپورٹ کالج کا دربان کرتا ہے۔ اور اگر آپ شہر میں رہتے ہیں تو یہ فرض آپکی لینڈ لیڈی ادا کرتی ہے۔ غرض ہر حالت میں رات کو دیر میں آنے کی رپورٹ صبح دس بجے آپ کے ٹیوٹر کی میز پر پہنچ جاتی ہے۔ ایک آدھ دن دیر میں آنے کی سزا صرف جرمانہ ہے۔ اور اگر دیر میں آنا آپ کی عادت بن گیا ہے تو یہ جرمانہ ذرا سخت قسم کی ڈانٹ ڈپٹ بن جاتا ہے رات کے بارہ بجے کے بعد آنے والوں پر ڈو آنے کی جگہ چھ شلنگ آٹھ پنس جرمانہ ہوتا ہے۔ جو طالب علمی کے زمانے میں خاصہ ناگوار گذرتا ہے۔ اس لئے بہت سے لڑکے اس جرمانے اور اتالیق کی ناگوار ڈانٹ ڈپٹ سے بچنے کے لئے آئے دن نت نئے ڈھنگ اختیار کرتے رہتے ہیں۔ اور ان اختراعوں میں جھٹ پھاند کر کالج میں داخل

ہونا سب سے زیادہ دلچسپ صورت ہے۔

کالجوں کی دیواروں اور چھتوں کو پھاندنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ کیونکہ سب کالجوں کی عمارتیں قدیم طرز تعمیر پر قلعہ نما بنی ہیں لیکن یاروں نے اس مُہم کو بھی ایک فن بنا لیا ہے۔ اور ہر روز نئے نئے طریقوں سے دیواریں پھاندنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے اس فنِ لطیف پر ایک نہایت مفصّل کتاب بھی چھپی ہے جسکے تجربہ کار مصنّفوں نے ہر کالج کی تصویر دے کر دیوار پھاندنے کی ترکیبیں بتائی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فن بہت پُرانا ہے۔ اور اس مضمون پر ایک عرصے سے طبع آزمائی ہوتی چلی آرہی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ دیوار پھاندنے والے بہادر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کام کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسے مجرموں کو دیوار پھاندنے کی پاداش میں یونیورسٹی سے نکال دیا جاتا ہے۔

یونیورسٹی کا ایک اور قانون کہ جس کی پابندی بہت لازم سمجھی جاتی ہے یہ ہے کہ سورج چھُپنے کے بعد ہر ایک طالبعلم کو سیاہ گاؤن اور ایک خاص قسم کی سیاہ ٹوپی پہننی پڑتی ہے۔ چنانچہ چراغ جلے کیمبرج کے بازاروں اور گلی کوچوں میں جا بجا کالے گاؤن ہوا میں اُڑتے نظر آتے ہیں۔ دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ کالا گاؤن پہن کر کوئی طالب علم سگریٹ

نہیں پی سکتا۔ ایسے قانونوں کو توڑنا کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ یونیورسٹی کی طرف سے دو پروکٹر (نگراں) اور چار سپاہی اس کام پر مقرر ہیں کہ رات کو بازاروں اور گلی کوچوں میں پھر کر طالب علموں کی جانچ پڑتال کرتے رہیں۔ یہاں کی زبان میں ان چار سپاہیوں کو بُل ڈاگ کہتے ہیں۔ اور واقعی یہ ہیں بھی بُل ڈاگ ہی۔ چراغ جلنے کے بعد سے یہ شہر کا گشت لگانا شروع کرتے ہیں۔ اور جہاں کسی طالب علم کو خلاف قانون حرکت کرتے دیکھ پاتے ہیں بہت ادب سے جاکر اس کا نام اور پتہ پوچھتے ہیں۔ دوسرے روز جرم کی نوعیت کے لحاظ سے طالب علم پر جرمانہ ہو جاتا ہے۔ کیمبرج اتنا چھوٹا سا شہر ہے کہ پروکٹر اور اُسکے سپاہیوں کی نظر سے بچنا تقریباً ناممکن ہے۔ سُنا ہے کہ ہمارے موجودہ بادشاہ سلامت جب کیمبرج میں پڑھتے تھے تو ایک دن شام کو گاؤن پہنے بازار میں سگرٹ پی رہے تھے۔ بھلا پروکٹر جیسا نظر باز کب چُوک سکتا تھا۔ چنانچہ یہ سگرٹ بادشاہ سلامت کو بہت مہنگا پڑا۔ کیونکہ دوسرے دن جرمانے کی فہرست میں ان کا نام بھی شامل تھا

ان بندشوں اور قاعدے قانون کی پابندیوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ طالب علموں اور شہریوں میں کبھی بدمزگی پیدا نہیں ہوتی۔ اور شہر کی زندگی میں یونیورسٹی کی وجہ سے بہت چہل پہل

رہتی ہے۔

کیمبرج کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۶۲ء
میں یہاں کُل طالب علموں کی تعداد مشکل سے ڈیڑھ ہزار تھی۔ اور
۳۷ء میں یہ تعداد بڑھتے بڑھتے پانچ ہزار تک جا پہنچی۔ ان میں سے
زیادہ تعداد تو ایسے طالب علموں کی ہے جو بی۔ اے میں پڑھتے
ہیں۔ انہیں کیمبرج میں انڈر گریجویٹ (Under-Graduate)
کہتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ لڑکے ایسے بھی ہیں جو بی۔ اے کے بعد
کسی خاص مضمون کی تحقیق کرتے ہیں۔ ہندستان میں یہ سُن کر غالباً آپکو
تعجّب ہوگا کہ کیمبرج میں ایم۔ اے کا امتحان نہیں ہوتا۔ بلکہ بی۔ اے
پاس کرنے کے دو سال بعد ہر طالب علم کو ایم۔ اے کی سند ملجاتی
ہے۔ صرف یونیورسٹی کو تین پونڈ فیس کے ادا کرنے پڑتے ہیں۔

کیمبرج کی زندگی کا دارومدار تمامتر بی۔ اے کے طالب علموں
پر سمجھنا چاہئے۔ شہر کی رونق، بازاروں کی چہل پہل، سینما اور تھیٹروں کی
گھما گھمی سب انہی نوجوانوں کے دم سے ہے۔ چراغ جلے ان نوجوان
طالب علموں کو کالے گاؤن سے پہچانا جا سکتا ہے۔ لیکن دن کے
وقت بھی یہ شہریوں سے بالکل الگ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کے
لباس کی بے پروائی، لمبے لمبے بکھرے ہوئے بال، اور چہروں سے

ذہانت اور شوخی کے آثار انہیں دوسرے شہریوں سے نمایاں کر دیتے ہیں۔ خاص طور پر لباس کے معاملے میں کیمبرج کے طالب علم اسقدر بے پرواہیں کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ سارے کیمبرج میں کوئی طالبعلم خوبصورت تراش کا صاف ستھرا سوٹ پہنے نظر نہیں آئے گا۔ اور اگر کوئی نوجوان عمدہ لباس میں نظر بھی آجائے تو سمجھ لیجئے کہ یا تو یہ کسی دکان پر سامان دکھانے والا ملازم ہے یا لندن سے کوئی سیّاح آنکلا ہے۔ طالب علموں کی گردنوں کے گرد سردیوں میں اپنے اپنے کالج کے رنگین مفلر لپٹے رہتے ہیں۔ اور یہ مفلر اسقدر لمبے ہوتے ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو غالباً اُنہیں کمبل کی جگہ اوڑھا بھی جاسکتا ہے۔ یہاں کے طالب علموں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ چاہے جتنی سردی پڑے اُورکوٹ نہیں پہنتے۔ معمولی کوٹ میں سوں سوں کرنا یہاں بانکپن کی نشانی ہے۔ اِس سال سردی کے موسم میں جب چھاجوں مینہ برس رہا تھا اور کئی کئی فٹ برف جم گئی تھی اُس وقت بھی یہ بانکے بازاروں اور سڑکوں پر اِسی طرح بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ کیونکہ چھتری کا استعمال یا ٹوپی پہننا بھی شیوۂ جوانمردی کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اِکّادُکّا اِس روایت کو توڑ بھی دیتے ہیں، کیمبرج کی زندگی کا نقشہ شاید اِس طرح آپ کی سمجھ میں زیادہ آسانی

سے آجائے گا اگر میں ایک طالب علم کی دن بھر کی کیفیت بیان کر دوں
طالب علم خواہ کالج میں رہے یا گھر پر صبح جلدی اُٹھنے کی کوئی قید
نہیں ہے۔ اس لئے کیمبرج میں عام طور پر صبح دس گیارہ بجے سے
پہلے نہیں ہوتی۔ اگرچہ بعض لکچر صبح نو بجے بھی شروع ہوتے ہیں۔ لیکن
لکچروں کی حاضری ضروری نہیں ہے، اس لئے اس سے طالب علموں
کی زندگی پر چنداں اثر نہیں پڑتا۔ طالب علم جب جی چاہتا ہے اُٹھتے
ہیں، ناشتہ کمرے ہی میں مل جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر جی چاہا تو کسی
لکچر میں شامل ہو گئے ورنہ اپنے کمرے ہی میں اخبار اور کتابوں کا مطالعہ
کرتے رہے۔ دوپہر کو ایک بجے کالج ہال میں لنچ ملتا ہے۔ لیکن اس میں بھی
حاضری ضروری نہیں ہے، اس لئے دوپہر کا کھانا زیادہ تر لڑکے شہر کے
ہوٹلوں میں کھاتے ہیں۔ سردیوں میں دن چونکہ چھوٹے ہوتے ہیں اسلئے
لنچ کے فوراً بعد ہی کھیل کی تیاری شروع ہو جاتی ہے۔ کیمبرج جس قدر
اپنی علمی فضیلت کی وجہ سے مشہور ہے اس سے کہیں زیادہ یہاں
کھیل کود کا چرچا ہے۔ طالب علموں اور یونیورسٹی کی جان یہاں کے
کھیل ہیں۔ اور تقریباً ہر ایک طالب علم ان میں حصّہ لیتا ہے۔ سب سے
زیادہ یہاں کشتی چلانے کا شوق ہے۔ کیونکہ شہر کے تین طرف دریا
بہتا ہے۔ بلکہ بعض کالجوں کی بالکل دیوار کے نیچے دریا ہے۔ ہر سال

کیمبرج اور آکسفورڈ کا کشتی کی دوڑ میں جو شاندار مقابلہ ہوتا ہے اب اُس کی دھوم ریڈیو کے ذریعہ تمام دنیا میں پھیل چکی ہے۔ اس مقابلے کی کئی مہینے پہلے سے تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اور اُن خوش قسمت نوجوانوں کو خاص عزّت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ جو اس مقابلے میں اپنی یونیورسٹی کی طرف سے شریک ہوتے ہیں۔ انہیں یونیورسٹی کی طرف سے نیلے مفلر انعام میں ملتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہیں "کیمبرج بلو" کہا جاتا ہے۔ جو یہاں بہت بڑے فخر کی بات ہے:۔

ہاں تو میں کھیلوں کا ذکر کر رہا تھا۔ تیسرے پہر سے کھیل شروع ہو جاتے ہیں۔ سردیوں میں ہاکی، فٹ بال، رگبی، سکواش۔ ٹینس۔ اور مُکّے بازی کا زور رہتا ہے۔ گرمیوں میں جب موسم ذرا کھُل جاتا ہے تو کرکٹ شروع ہوتی ہے۔ شام تک کھیل کود سے فارغ ہو کر سب اپنے اپنے کمرے پر پہنچ جاتے ہیں۔ اب چائے کا دَور چلتا ہے ہر ایک طالب علم اپنے دوستوں کے ساتھ چا پیتا ہے۔ چائے کے بعد گپ اور تاش کی بازی اُڑتی ہے۔ اتنے میں رات کے کھانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ ہفتے میں کم از کم پانچ دفعہ کالج میں کھانا ضروری ہے۔ اس لئے اپنے اپنے گاؤن پہن سب کالجوں کو چل دیتے ہیں۔ کھانے کے بعد کچھ لڑکے سینما، تھیٹر یا کسی کلب کے جلسے

میں چلے جاتے ہیں۔ اور پڑھنے لکھنے والے کمرے پر جاکر اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ رات کے دس بجے تک کیمبرج کے سینما، تھیٹر، قہوہ خانے اور بازار طالب علموں سے بھرے رہتے ہیں لیکن دس بجے بجتے سب خالی ہو جاتے ہیں اور ہر طالب علم تیزی سے اپنے گھر یا کالج کا راستہ ناپتا نظر آتا ہے۔ اسی ہجوم میں بُل ڈاگ اور پروکٹر بھی قانون شکنوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں۔ دس بجے کے بعد بازاروں میں اکا دکا طالب علم نظر آتے ہیں۔ اور آدھی رات کے بعد تو بازار بالکل سنسان ہو جاتے ہیں، اور اگر اب بھی کوئی آپ کو باہر نظر آجائے تو سمجھ لیجئے کہ ان حضرت کا ارادہ دیوار پھاندنے کا ہے۔

اسی بھاگ دوڑ اور زندگی کی چہل پہل میں کیمبرج کے طالب علم بہت سی انجمنوں اور مجلسوں میں بھی شرکت کرتے ہیں۔ ہر مذاق اور ہر طبیعت کے طالب علموں کے لئے کلب یا انجمن موجود ہے۔ اور عام طور پر ہر ایک طالب علم دو چار انجمنوں کا ممبر بھی ضرور ہوتا ہے۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہی مجلسیں اور انجمنیں کیمبرج کی سماجی زندگی کی جان ہیں۔ ان میں شریک ہونے سے اُٹھنے بیٹھنے کے آداب اور بولنے چالنے کے قاعدوں سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ اور کیمبرج کے طالب علموں کی آئندہ زندگی میں جو ایک خاص قسم کا

سُتھرا پن، سنجیدہ مذاق اور شگفتگی پائی جاتی ہے ان سب باتوں کی بُنیاد انہی انجمنوں میں رکھی جاتی ہے۔ ایسی مجلسوں میں سب سے بڑی کیمبرج یونین سوسائٹی ہے۔ جس کی روائتیں ہاؤس آف کامنز سے کم نہیں۔ اس میں ہر ہفتے منگل کی شام کو دلچسپ مباحثہ ہوتا ہے۔ اور عام طور پر اُس روز باہر سے کوئی معزز مہمان بھی بُلوایا جاتا ہے۔ یونین کے جلسوں میں شریک ہونے سے ایک تو عام واقفیت کافی بڑھتی ہے، دوسرے تقریر کرنے کا انداز معلوم ہو جاتا ہے۔ جو آئندہ بہت کام آتا ہے۔ یونین کے جلسوں کا ہال اور کتب خانہ[ل] دیکھنے کے قابل جگہ ہے۔ اسکا انتظام طالب علموں کے سُپرد ہے۔ اور یونین کا صدر طالب علموں میں بہت بڑی چیز سمجھا جاتا ہے۔

یونین کے علاوہ کیمبرج میں چھوٹی بڑی بہت سی انجمنیں بھی ہیں، ہندُستانیوں نے اپنے لئے ایک مخصوص انجمن بنائی ہے۔ اس کا نام مجلس ہے۔ مجلس میں ہندستانیوں کے علاوہ بہت سے انگریز بھی شریک ہوتے ہیں۔ تھیٹر اور ڈرامے کے رسیا طالب علم ہر سال ایک آدھ ڈرامہ بھی اسٹیج کرتے ہیں۔ اور یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے ڈرامے لندن کے اچھے اچھے ڈراموں سے کسی طرح کم نہیں ہوتے کیمبرج

ل افسوس کہ اپریل ۱۹۴۱ء میں یونین کا ہال اور کتب خانہ جرمنوں کی بمباری کا نشانہ بن گیا۔

کی انجمنوں کے نام بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً ایک کا نام مگرمچھوں کی انجمن ہے۔ اِس کے ممبر ایک خاص قسم کی ٹائی باندھتے ہیں جس پر مگرمچھ کی تصویر ہوتی ہے۔ ابھی حال میں چند ہندستانیوں نے اردو ہندی کے میل جول کے لئے ایک انجمن بنائی ہے اور اس کا نام کھچڑی رکھا ہے لیکن ابھی تک یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ کھچڑی کے ممبروں کی ٹائی پر کونسا نشان بنایا جائے۔

اب آپ ایک طالب علم کی دن بھر کی زندگی پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کا وقت مختلف دلچسپیوں میں اسقدر بٹا رہتا ہے کہ اُسے پڑھنے لکھنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے کہ یونیورسٹی کی زندگی میں پڑھنے لکھنے سے زیادہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت لگ جاتا ہے لیکن یہ نہ سمجھ لیجئے کہ ان کا یہ وقت ضائع ہوگیا۔ نہیں یہ بھی ان کی تعلیم کا ایک ضروری جزو ہے۔ کیمبرج میں سال بھر میں تین دفعہ چھٹیاں ہوتی ہیں۔ اور جو زمانہ کہ طالب علم یونیورسٹی میں گذارتے ہیں وہ ایک ٹرم کہلاتا ہے۔ سال کی پہلی ٹرم اکتوبر سے دسمبر تک، دوسری جنوری کے آخر سے مارچ تک اور تیسری اپریل سے جون کے آخر تک ہوتی ہے۔ ایک ایک ٹرم تقریباً آٹھ ہفتے کی ہوتی ہے گویا سب ملا کر سال بھر میں مشکل سے چھ مہینے یونیورسٹی میں رہنا ہوتا ہے

اور ظاہر ہے کہ ان دنوں میں پڑھنے لکھنے کا بہت کم موقع ملتا ہے عام طور پر اصلی کام چھٹیوں میں کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ٹرم کے دوران میں بھی آپ کبھی یونیورسٹی لائبریری چلے جائیے تو سینکڑوں طالب علم کتابیں پڑھتے نظر آئیں گے لیکن یہاں یہ صرف مواد جمع کرتے ہیں گویا گائے بیل کی طرح اسے جلدی جلدی نگل لیتے ہیں۔ پھر چھٹیوں میں فرصت سے بیٹھ کر اس کی جگالی کرتے ہیں۔ بہت سے طالب علم چھٹیوں میں بھی یونیورسٹی ہی میں رہتے ہیں۔ کیونکہ اُن دنوں کھیلوں، تماشوں سے فرصت مل جاتی ہے، اور یکسوئی سے دل لگا کر پڑھ سکتے ہیں سب سے حیرت کی بات کیمبرج میں یہ دیکھنے میں آئی کہ یہاں لڑکیوں کو لڑکوں کے کالجوں میں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ایک مدت تک تو انہیں یونیورسٹی میں داخل ہی نہیں کیا جاتا تھا۔ لیکن اب تقریباً ستّر سال سے لڑکیوں کے لئے دو کالج کھُل گئے ہیں۔ اور ۱۹۲۱ء سے لڑکیوں کو باضابطہ بی۔ اے کی ڈگری ملنے لگی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے لڑکیاں پڑھتی ضرور تھیں۔ مگر اُنھیں امتحان پاس کرنے کے باوجود ڈگری لکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اب بھی لڑکیوں کو گاؤن پہننے کی اجازت نہیں ہے۔ ان دونوں کالجوں میں مجموعی طور پر صرف پانسو لڑکیاں پڑھ سکتی ہیں۔ اس سے زیادہ داخل کرنے کی اجازت نہیں،

سب سے لطف کی بات یہ ہے کہ کیمبرج یونین میں لڑکیوں کو ممبر نہیں بنایا جاتا۔ اور یونین کے جلسوں میں مہمان کی حیثیت سے بھی یہ ہال میں نہیں بیٹھ سکتیں۔ بلکہ ان کے بیٹھنے کے لئے ہال کے اوپر ایک خاص گیلری ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہاں یہ بالکل خاموش بیٹھی رہیں۔ اگر کوئی لڑکی حاضرین کے ساتھ مل کر تالیاں بجا دے تو یونین کے عہدے دار اُسے فوراً روک دیتے ہیں۔

اب چند سال سے یونیورسٹی کے لکچروں میں لڑکیوں کو لڑکوں کے ساتھ شامل ہونے کی اجازت مل گئی ہے۔ لیکن عام طور پر ان لکچروں میں لڑکیاں اچھوتوں کی طرح لڑکوں سے الگ بیٹھتی ہیں۔ اور لکچر کے دوران میں استاد کبھی لڑکیوں سے مخاطب نہیں ہوتے۔ بلکہ ان سے ایسی بیرخی برتتے ہیں جیسے لڑکیاں جماعت میں ہیں ہی نہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم کے زمانے کا ایک دلچسپ واقعہ سُننے میں آیا ہے کہ اُن دنوں کیمبرج کے ایک مشہور پروفیسر ہمیشہ اپنا لکچر لفظ جنٹلمین سے شروع کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ان کی جماعت کے سب لڑکے غیر حاضر ہو گئے۔ اُس روز لکچر میں صرف لڑکیاں ہی شریک ہوئیں۔ پروفیسر صاحب نے اپنی عینک کے شیشوں میں سے تمام جماعت پر نظر دوڑائی اور یہ کہتے ہوئے جماعت سے نکل گئے کہ آج کوئی سننے والا ہی نہیں آیا

تو میں لکچر کیا خاک دوں ‌‌‌٭

اب تک میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کیمبرج کی عام زندگی کے متعلق لکھا ہے۔ اس میں ہندستانی طالب علموں کا خاص طور پر میں ذکر نہیں کیا۔ یہ اس لئے کہ جب تک آپ کیمبرج کی زندگی کا نقش اپنے ذہن میں نہ جمالیں اُسوقت تک یہاں کے ہندستانی طالب علموں کا حال سمجھنا دُشوار ہے۔ انگلستان کے متعلق ہندستانیوں کو اب تک یہ شکایت ہے کہ یہاں ہندستانیوں سے برابری کا سلوک نہیں کیا جاتا۔ ممکن ہے کہ یہ شکایت اور شہروں کے متعلق دُرست ہو۔ لیکن کیمبرج کی تعلیمی زندگی میں ایسا فرق کبھی روا نہیں رکھا جاتا۔ اسی لئے ہندُستانی یہاں آکر یہ بالکل بھُول جاتے ہیں کہ ہم وطن سے ہزاروں میل دُور ایک نئے ملک میں ہیں۔ کیمبرج کے پانچہزار طالب علموں میں ہر سال تقریباً سوا سو ڈیڑھ سو کے درمیان ہندستانی طالب علم شرکت کرتے ہیں۔ نسبتاً ان کی تعداد مشکل سے تین فیصدی نکلتی ہے لیکن اس کے باوجود ہندستانی طالب علموں نے اپنی ذہانت اور قابلیت کا سکہ بٹھا دیا ہے، پڑھنے لکھنے والوں میں ہر سال دو چار ہندُستانی نام فہرست کے اوپر نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے علمی اور ذہنی اعتبار سے ہندُستان کبھی مغرب سے پیچھے نہیں رہا۔ سب سے

فخر کی بات یہ ہے کہ کھیل کود انگریزوں کی قومی خصوصیت سمجھی جاتی ہے لیکن اس میدان میں بھی اکثر ہندستانی اپنے انگریز حریفوں سے بازی لے جاتے ہیں۔ مثلاً کیمبرج کی کرکٹ ٹیم میں آج تک رنجیت سنگھ جی کا نام ادب سے لیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ ابھی چند سال ہوئے حیدرآباد دکن کے نوجوان کھلاڑی بھارت چند کھنّہ اور پنجاب کے جہانگیر خاں نے بھی اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ ٹینس خاص یورپ کا کھیل ہے۔ لیکن ہر سال کیمبرج کی اوّل درجے کی ٹیم میں ایک دو ہندستانی ضرور شامل رہتے ہیں، ان سب باتوں کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے نوجوان بھی انگریز نوجوانوں کے دوش بدوش مقابلہ کر سکتے ہیں۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ کیمبرج میں ہندوستان کے حالات سے کافی دلچسپی لی جاتی ہے۔ مثلاً کیمبرج یونین کی بحثوں میں اکثر ہندستان کی سیاسیات کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ ۳۹ء کی سردیوں میں ہندستان کے متعلق ایک بحث سننے والوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ یونین ہال اور گیلری میں کھڑے رہنے تک کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اسی زمانے میں ایک بڑا جلوس ہندستان کی حمایت میں نکالا گیا تھا جس میں ہندستانی طالب علموں سے زیادہ تعداد انگریز لڑکوں اور لڑکیوں کی تھی جو بڑے بڑے پوسٹر اٹھائے ہندستان کی آزادی کے لئے نعرے لگا رہے تھے۔ ابھی کچھ دن ہوئے

ہندستان کے اقتصادی حالات کے متعلق ایک نہایت دلچسپ نمائش بھی ہوئی تھی جس میں صبح شام طالب علموں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اس وقت کیمبرج میں بہت سے ایسے پروفیسر موجود ہیں کہ جن کا ایک مدت تک ہندستان سے تعلق رہا ہے۔ مثلاً ایک کالج کے پرنسپل سی۔ پی۔ کے سابق گورنر سر مانٹیگو بٹلر ہیں کہ جن کے بڑے بھائی سر ہارکورٹ بٹلر کا نام لکھنؤ کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ اور یہ خود بھی ایک عرصہ تک پنجاب اور دہلی میں رہ چکے ہیں۔

کیمبرج مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لئے ایک عرصے سے مشہور ہے۔ بلکہ انگلستان میں سب سے پہلے کیمبرج ہی کے ایک فاضل اُستاد نے سنسکرت کی تعلیم کی بُنیاد رکھی تھی۔ اگرچہ یورپ کی اور یونیورسٹیوں میں مشرقی زبانوں پر ایک زمانے سے تحقیق ہو رہی تھی۔ فارسی ادبیات کی تاریخ میں پروفیسر براؤن کا نام کون نہیں جانتا۔ مشرقی زبانوں کے لئے جو کچھ انہوں نے کام کیا ہے اس کی مثال دنیا بھر میں ملنی مشکل ہے۔ یہ بھی کیمبرج ہی کے اُستاد تھے۔ کچھ عرصے سے کیمبرج میں اُردو اور ہندی پڑھانے کا بھی باقاعدہ انتظام ہو گیا ہے۔ اگرچہ فی الحال ان زبانوں کی تعلیم انڈین سِول سروس کے اُمیدواروں تک محدود ہے۔ اگر میری یاد غلطی نہیں کرتی تو اُردو کے مشہور ادیب شمس العلما ڈاکٹر سید حسین بلگرامی

کیمبرج میں اُردو پڑھانے پر مامور تھے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی لائبریری میں عربی، فارسی، سنسکرت اور دوسری ہندُستانی زبانوں کے متعلق نہایت عمدہ مواد موجود ہے جس کا ذکر انشاء اللہ کسی اور صحبت میں کرونگا۔

اسقدر لکھنے کے باوجود کیمبرج میں ہندُستانی طالب علموں کا نقشہ مکمل نہیں ہوا۔ کیونکہ جب تک میں ہندُستانی ہوٹل کا ذکر نہ کروں کیمبرج کی زندگی ادھوری رہی جاتی ہے۔ کیمبرج میں یوں تو سیکڑوں ہوٹل اور ریسٹوران ہیں لیکن ہندستانی ہوٹل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جو چٹخارہ اور لطف، ذائقے کو یہاں ملتا ہے کہیں اور نصیب نہیں ہوتا اسلئے اکثر ہندستانی اپنے انگریز احباب کو ایک آدھ مرتبہ یہاں کا مزہ ضرور چکھا دیتے ہیں اور جو انگریز ایک دفعہ بھی یہاں کا مزہ چکھ لیتا ہے اسے ہندستانی کھانوں کی ایسی چاٹ لگتی ہے کہ بقول استاد ذوق ع

چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اور یہی ہندستان کی سب سے بڑی جیت ہے۔

اپریل ۴۰ سنہ ء

وزیرِ ہند سے مُلاقات

کسی نے لندن کو سلطنتِ برطانیہ کا دل کہا ہے۔ اگر لندن سلطنتِ برطانیہ کا دل ہے تو وائٹ ہال کو برطانیہ کا دماغ سمجھنا چاہئے۔ ویسٹ منسٹر کے قدیم گرجا گھر، بگ بن کے فلک نما گھنٹہ گھر، اور پارلیمنٹ کی تاریخی عمارتوں کے سامنے بہت سے سرکاری دفتر ہیں۔ اور ان کے مجموعے کا نام وائٹ ہال ہے۔ اسی علاقے میں پریوی کونسل کی عمارت ہے۔ اس کے دروازے پر انصاف کی دیوی آنکھوں پر پٹی باندھے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ترازو لئے کھڑی ہے۔ خدا جانے اس عمارت کے اندر کیسے کیسے عظیم الشان فیصلے سُنائے جا چکے ہیں۔ کیسی کیسی قانونی الجھنوں کی موشگافی ہو چکی ہے۔ اس کے برابر وزیرِ خارجہ کا دفتر ہے۔ دُنیا کی قسمت کا فیصلہ اسی دفتر میں ہوتا ہے۔ اسی سڑک پر ایک چھوٹا سا رستہ ہے۔ ہے تو یہ چھوٹا سا رستہ لیکن برطانیہ کے

ناخدا کا مکان اسی سڑک پر ہے۔ اس سڑک کا نام ڈاؤننگ اسٹریٹ ہے۔ اور یہاں دس نمبر کے مکان میں برطانیہ کے وزیر اعظم مسٹر چرچل رہتے ہیں۔ لڑائی سے پہلے اس مکان کے سامنے ہر وقت تماشائیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ لیکن اب سڑک کے ناکے پر پولیس کا پہرہ بیٹھ گیا ہے۔ اور کوئی شخص بغیر خاص اجازت کے اس بازار میں داخل نہیں ہو سکتا۔ انہی تاریخی عمارتوں میں انڈیا آفس بھی ہے۔ یہاں وزیر ہند رائٹ آنریبل مسٹر ایل۔ ایس۔ ایمرے۔ سے ملنے میں جا رہا ہوں ؟

ساڑھے تین بجے ملاقات کا وقت مقرر ہے۔ لیکن میں آدھ گھنٹہ پہلے ہی پہنچ گیا۔ تاکہ عمارت کی بھی سیر کر لوں۔ لمبے لمبے دالانوں، زینوں راستوں اور کمروں میں سے گذرتا ہوا میں وزیر ہند کے پرائیویٹ سکریٹری کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھایا گیا۔ مسٹر ایمرے کے پرائیویٹ سکریٹری مسٹر ہیری سن کمرے میں داخل ہوئے۔ نہایت متین، سنجیدہ، سبک رفتار، تعلیم یافتہ نوجوان ہیں۔ میں نے اُن سے کہا۔ پہلے میں انڈیا آفس کی عمارت دیکھنا چاہتا ہوں۔ اُنہوں نے فوراً ایک ایسے افسر کو بلوا لیا جو مدت سے ریکارڈ آفس کے مہتمم ہیں۔ اور عمارت کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ میں تو انہیں انڈیا آفس کی جیتی جاگتی ڈائرکٹری سمجھتا ہوں۔ یہ میز فلاں سن میں ہندستان سے آئی تھی۔ یہ تصویر فلاں تاریخی

واقعے کی ہے۔ یہ شاہ عالم ۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندستان کے دیوانی اختیارات کا پٹہ دے رہے ہیں۔ ان کے سامنے نہایت ادب سے کلائیو جھکے شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ یہ شملے کا جاکھو پہاڑ ہے۔ یہ درّہ خیبر کی تصویر ہے۔ یہ بنارس کے گھاٹ کا منظر ہے۔ غرض انڈیا آفس کی تصویریں کیا ہیں۔ ہندستان کی تاریخ کا نگار خانہ ہیں +

اسی دفتر میں وزیر ہند کے تینوں ہندستانی مشیر اور صلاح کار بھی کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر رگھو وندر راؤ آج کل میں وائسرائے کے وزیر ہو کر ہندستان جانے والے ہیں۔ جلدی جلدی ان سے ملاقات کی۔ سر حسان سہروردی سے کون واقف نہیں۔ یہ بھی چند مہینے کی چھٹی پر ہندستان جا رہے ہیں۔ جب ملتے ہیں بے حد تپاک اور ہمدردی سے ملتے ہیں ان کی خدمت میں بھی حاضری دی۔ تیسرے مشیر دیوان بہادر رنگا ناتھن مدراس یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اب اقلیتوں کی طرف سے وزیر ہند کو مشورہ دیتے ہیں۔ کھڑے کھڑے ان سے بھی ملاقات ہوئی +

تیسری منزل پر انڈیا آفس کا کتب خانہ ہے۔ اور یہ دیکھنے دکھانے کے قابل چیز ہے۔ ہندستان اور مشرقی ملکوں کے متعلق طالب علموں کو جو بیش بہا سالہ اور قیمتی مواد اس کتب خانے سے مل سکتا ہے۔ وہ

غالباً دنیا میں کہیں ایک جگہ ہاتھ نہیں لگ سکتا۔ لڑائی سے پہلے انڈیا آفس کی لائبریری میں علم کے پیاسوں کا ایک ہجوم لگا رہتا تھا۔ کوئی ہندستان کے قدیم فلسفے پر چھان بین کر رہا ہے۔ کوئی ہندستان کی موسیقی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ایک امریکی ماہر ہندستان کی مصوّری کے نمونے پرکھ رہا ہے۔ انڈیا آفس لائبریری کے متعلق کسی نے یہ بالکل سچ کہا ہے کہ اس وقت دنیا بھر میں کوئی ایسا عالم اور مستشرق موجود نہیں کہ جو ہندستان کے متعلق تحقیق کرے اور اس سلسلے میں انڈیا آفس لائبریری کا دروازہ نہ کھٹکھٹائے۔ گذشتہ پچاس سال میں ہندستان کے متعلق جس قدر بھی علمی اور تاریخی تحقیق ہوئی ہے اس کا سرچشمہ انڈیا آفس لائبریری ہے۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے کہ اس پر انڈیا آفس کو بجا طور سے ناز ہے۔

سنہ ۳۵ء میں انڈیا آفس لائبریری میں ۲ لاکھ ۳۰ ہزار چھاپے کی کتابیں اور ۲۰ ہزار قلمی مسودے رکھے تھے۔ ان میں سے اکثر مسودے ایسے نادر نسخے ہیں کہ ان کی نقل دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی۔ اس کتاب خانے میں مشرقی زبانوں کی کتابوں کی فہرست سن کر شاید آپ کو تعجب ہوگا۔ عربی اور فارسی کی دس ہزار کتابیں، سنسکرت پالی اور پراکرت کی ۲۲ ہزار جلدیں، ۱۸ سو کتابیں چینی زبان کی۔ ژند پہلوی کی دو سو کتابیں بنگالی کی ۲۴ ہزار کتابیں۔ ہندی کی ۱۹ ہزار چار سو جلدیں۔ گجراتی کی ساڑھے

نوہزار۔ پنجابی کی ۵۹۲۵ اور اُردو کی ۱۹ ہزار کتابیں۔ اس فہرست میں میں نے ابھی آسامی۔ کناری۔ ملیالم۔ مرہٹی۔ نیپالی۔ تبتی۔ پشتو۔ سنتالی۔ سندھی۔ تامل۔ تلیگو اور دوسری زبانوں کا نام تک نہیں لیا۔

لائبریری کے برابر ہی ریکارڈ آفس ہے۔ اسے میں تاریخ کا عجائب گھر سمجھتا ہوں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پرانے ریکارڈ۔ فائل۔ دستاویزیں احکام غرض ان کی فہرست بتائی جائے تو گھنٹے بھر کا کام ہے۔ ایک پرانا اور بوسیدہ رجسٹر یہاں دیکھ کر میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ یہ رجسٹر سینٹ ہیلی نا کے جزیرے سے یہاں آیا ہے۔ اس جزیرے میں نپولین قید تھا۔ اور یہیں نپولین مرا۔ رجسٹر میں ایک جگہ لکھا ہے: "۵ مئی ۱۸۲۱ء آج نپولین بونا پارٹ مرگیا۔" نپولین جیسے فاتح اور جرنیل کی موت کا ذکر ان سادہ لفظوں میں۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے۔ تاریخ اور ریکارڈ آفس سب انسانوں سے برابر کا سلوک کرتے ہیں۔ اور ریکارڈ آفس کی نظر میں نپولین بھی ایک انسان تھا۔

لیجئے ساڑھے تین بج گئے۔ مسٹر ہیری سن دروازے پر کھڑے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے اندر جاکر مسٹر ایمرے وزیر ہند کو اطلاع کی۔ اور اُلٹے پاؤں آکر بغل والے کمرے میں مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ نہایت آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اور میرے نام کا اعلان کرد

ایک بڑے لیکن نہایت سادہ کمرے میں کھڑکی کے برابر ایک بہت بڑی میز ہے۔ اور میز کے سامنے ایک شخص عینک لگائے جھکا ہوا فائل دیکھ رہا ہے۔ پہلی نظر میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس شخص کا قد بہت چھوٹا ہے لیکن جسم بہت بنا ہوا ہے۔ چوڑا سینہ، گٹھا ہوا بدن، مضبوط شانے، ساٹھ سال سے اونچی عمر لیکن چہرے پر رونق۔ اطلاع سنتے ہی انہوں نے گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اور مسکراتے ہوئے کرسی سے اُٹھے۔ ان کی مسکراہٹ۔ چہرے کی شگفتگی، آنکھوں کی چمک اور اس طرح بے تکلفی سے میری طرف ہاتھ بڑھانا۔ ان سب باتوں کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ جب میں نے ہاتھ ملایا تو ایسا معلوم ہوا کہ میرا ہاتھ شکنجے میں جکڑا گیا۔ ان کا مضبوط ہاتھ اور بھرا ہوا جسم بتا رہا تھا کہ مسٹر ایمرے کو کسرت کا بہت شوق ہے۔ اور اس عمر میں بھی جو یہ رونق اور پھرتی ان کے جسم میں موجود ہے اُسے بنانے میں انہوں نے بہت محنت کی ہوگی۔

مسٹر ایمرے نے مجھ سے سامنے والی آرام کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ اور خود اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے ”انڈیا آفس تمہارے ہندستان کی ملکیت ہے، تم نے اُسے دیکھا؟“

میں نے کہا ”جی ہاں، ابھی آپ کے ایک افسر نے مجھے انڈیا آفس

کی سیر کرائی ہے۔ اور اب مجھے یہ سُن کر اور بھی خوشی ہوئی کہ میں ایک ایسی عمارت میں بیٹھا ہوں جو میرے وطن ہندُستان کی ملکیت ہے۔" میں نے مسٹر ایمرے سے پوچھا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ضلع گورکھپور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کو ہندُستان کی کچھ باتیں یاد ہیں؟"

یہ سوال سنتے ہی اُن کی آنکھوں میں ایک خاص چمک پیدا ہو گئی۔ جیسے کوئی دور کے دُھندلے نقش اُجاگر کرنے کی کوشش کرے۔ ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔ "مجھے اپنی آیا اب تک یاد ہے۔ اس کا نام ایلا ئنزا تھا۔ ہندُستان سے آنے کے بہت دن بعد تک ہر سال اُسے میں کرسمس کے موقعے پر تحفے بھیجا کرتا تھا۔ یہ بھی مجھے اکثر اپنا دُکھ درد لکھتی رہتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے مجھے خط لکھا کہ میرے گائے بیل میرا ایک ہمسایہ زبردستی کھول کر لے گیا۔ میں نے اُسے تسلّی تشفّی کا خط بھیجا لیکن بہت دن بعد یہ خط ہندستان سے واپس آگیا۔ اس کی پُشت پر لکھا تھا۔ ایلا ئنزا مر گئی۔ یہ ۱۸۹۴ء یا ۱۸۹۵ء کا واقعہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہندُستان کی اور کیا کیا باتیں آپ کو یاد ہیں؟"

بولے۔ "میرے والد جنگلات کے محکمے میں ملازم تھے۔ اور اُن کا اکثر وقت دورے میں کٹتا تھا۔ ہاتھی کی سواری، ترائی کے جنگل، شکار، اور چھولداری کی زندگی مجھے اب تک یاد ہے۔ ہندستان سے ولایت

آنے کے بعد ہم دونوں بھائی ایک مدت تک آپس میں ہندوستانی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ اور اس پر ہماری انگریز نرس بہت جھنجلاتی تھی لیکن بعد میں ایکا ایکی ہم یہ زبان بھول گئے"۔

شاید یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ انگلستان کے مشہور ہیرو اسکول میں مسٹر چرچل اور مسٹر ایمرے ایک ہی وقت میں پڑھتے تھے بلکہ مسٹر ایمرے مسٹر چرچل سے ایک آدھ جماعت آگے تھے۔ مسٹر ایمرے نے اپنی سوانح عمری میں یہ دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک دن اسکول میں تالاب کے کنارے چرچل نے اڑنگا مار کر مجھے تالاب میں پھینکدیا جب میں تالاب سے باہر نکلا تو مجھے یہ دیکھ کر بے حد غصہ آیا کہ مجھ سے نچلی جماعت کے ایک لڑکے نے مجھے اس طرح سب کے سامنے تالاب میں دھکیلا ہے۔ چنانچہ پانی سے نکلتے ہی میں نے اپنا بدلہ لیا۔ اور اس لڑکے کو پکڑ کر پانی میں خوب ڈبکیاں کھلائیں۔ یہ مسٹر ایمرے اور مسٹر چرچل کی پہلی ملاقات تھی۔

میں نے مسٹر ایمرے سے پوچھا۔ "سنا ہے آپ کو بہت سی مشرقی زبانیں بھی آتی ہیں۔ یہ آپ نے کہاں سیکھیں"؟

بولے "جب میں آکسفورڈ میں پڑھتا تھا تو میرا ارادہ سفارت خانے میں ملازمت حاصل کرنے کا تھا۔ ایک سال چھٹیوں میں میری ایک

ٹرک سے ملاقات ہوگئی۔ اُسے میں نے اپنا مہمان بنایا۔ اوراس سے ترکی زبان سیکھ لی۔ اس کے بعد بلقان کی ریاستوں کا دورہ کیا۔ اور وہاں جاکر سرب قوم کی زبان سیکھ لی۔ تھوڑی سی عربی اور فارسی سے بھی شُد بُد ہوگئی۔"

میں نے کہا "کچھ یاد ہو تو سنائیے۔"

مسٹر ایمرے نے مُسکراتے ہوئے سورہٗ فاتحہ پڑھ کر سنا دی۔ جب مسٹر ایمرے نے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین پڑھا، تو میں نے زور سے کہا۔ آمین۔

اس کے بعد مسٹر ایمرے نے مجھے خواجہ حافظ کی مشہور غزل سنائی۔ جس کا مطلع ہے ؎

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دل مارا
بخالِ ہندواش بخشم سمرقند و بخارا را

اُنہوں نے مطلع سے لے کر مقطعے تک ایک ایک شعر مزے لے لے کر پڑھا۔ لہجہ انگریزی تھا لیکن الفاظ کی صحت اور تلفظ میں کہیں فرق نہیں تھا۔ میں نے اوروں سے سُنا ضرور تھا کہ وزیر ہند کو مشرقی ادب سے دلچسپی ہے لیکن آج اپنے کانوں سے اوران کی زبان سے یہ سب باتیں سُن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

مسٹر ایمرے کو سیر و سیاحت کا بہت شوق ہے۔ اور پہاڑوں پر چڑھنے کا شوق تو جنون کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ یورپ کے اونچے اونچے پہاڑ، جنوبی افریقہ کے کوہستان۔ کنیڈا۔ نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کی برفانی چوٹیاں، سب ان کا تختۂ مشق بن چکی ہیں۔ بلکہ جنوبی افریقہ اور کنیڈا میں تو پہاڑیوں کے نام ان کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ غالباً پہاڑوں پر چڑھنے کا شوق انہیں اس وجہ سے ہوا کہ ان کی پیدائش ہمالیہ پہاڑ کی گودی میں ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ ماونٹ ایورسٹ پر چڑھنے والی مہم میں بھی ان کا نام شامل کیا گیا تھا۔ لیکن کسی خاص مجبوری کی وجہ سے یہ جا نہیں سکے۔ اور اس کا انہیں اب تک افسوس ہے۔

مسٹر ایمرے نے زندگی ایک اخبار نویس کی حیثیت سے شروع کی تھی۔ اور اخبار ٹائمز کے نمائندے بنا کر یہ بوئر وار کا حال دیکھنے کے لئے جنوبی افریقہ بھیجے گئے تھے۔ بوائر وار کے بعد انہوں نے اس لڑائی کے متعلق تاریخ کی کئی کتابیں بھی لکھیں جو اس وقت تمام دنیا میں سند مانی جاتی ہیں۔ مسٹر ایمرے شاعر بھی ہیں۔ اور انگریزی زبان کے ایک عمدہ خوش بیان ادیب کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت مسلم ہے۔ اخبار نویسی سے یہ سیاست میں پڑے۔ سیاست انہیں ہاؤس آف کامنز میں لائی۔ اور ہاؤس آف کامنز سے یہ وزارت کی کرسی پر بیٹھے۔ اب سے

پہلے بھی یہ کئی سال تک برطانیہ کے وزیر رہ چکے ہیں۔ مسٹر چرچل نے سنہ ۴۰ء میں جب نئی وزارت بنائی تو وزیر ہند کا عہدہ ان کے سپرد کیا۔ گویا آج سے پچاس برس پہلے جو دوستی ہیرو اسکول میں تالاب کے کنارے شروع ہوئی تھی اس کی یاد برطانیہ کے وزیر اعظم اور وزیر ہند کے دلوں میں آج بھی تازہ ہے۔

اس دلچسپ گفتگو کے بعد میں نے مسٹر ایمرے سے اجازت مانگی۔ یہ مشرقی اخلاق کا زندہ نمونہ ہیں۔ دروازے تک مجھے چھوڑنے آئے۔ خود دروازہ کھولا اور میں رائٹ آنریبل مسٹر ایل۔ ایس ایمرے وزیر ہند سے رخصت ہوا۔

۲۶۔ اگست سنہ ۴۱ء

پارلیمنٹ میں ہندستان پر بحث

سر اسٹافرڈ کرپس نے ہندستان سے آکر بیان دیا

میں آج صبح وقت سے ذرا پہلے ہی پارلیمنٹ میں پہنچ گیا۔ اور اسے میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ آج ہندستان پر بحث ہونے والی تھی۔ اور ہندستان سے واپسی کے بعد سر اسٹافرڈ کرپس کی پہلی تقریر تھی۔ اس لئے تماشائیوں کا بہت ہجوم تھا۔ ایکا ایکی بڑے دالان میں کسی نے زور سے کہا "خاموش! جناب صدر تشریف لاتے ہیں" یہ سنتے ہی سب تماشائی خاموش کھڑے ہو گئے۔ ہمارے سامنے پولیس کے سپاہی حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ ان کے افسر نے حکم دیا سب اپنی اپنی ٹوپیاں اُتار لیجئے، صاحب صدر آرہے ہیں۔ پولیس والوں نے اور سب تماشائیوں نے تعظیماً اپنی ٹوپیاں اُتار لیں۔ اور ادب سے سر جھکا کر تمام تماشائی خاموش ساکت کھڑے ہو گئے۔

اتنے میں سیاہ لباس پہنے ایک شخص ہاتھ میں سونے کا عصا لئے ایک کمرے سے نکلا۔ اس کے پیچھے پیچھے دو آدمی تلواریں لگائے آرہے تھے۔ اور ان کے پیچھے سیاہ چُغہ اور ہائی کورٹ کے ججوں جیسا وگ (بڑا سا) پہنے پارلیمنٹ کے صدر تشریف لائے۔ یہ سارا جلوس سیدھا پارلیمنٹ کے ہال کمرے میں داخل ہوگیا۔ ابھی تک تماشائیوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ پہلے پارلیمنٹ کے سب ممبر دعا مانگیں گے۔ اور دعا کے بعد تماشائیوں کو گیلری میں جانے کی اجازت ملے گی۔

پارلیمنٹ میں اوپر چاروں طرف تماشائیوں کے بیٹھنے کا انتظام ہے۔ ایک جگہ صرف بادشاہ سلامت اور شاہی خاندان کے لئے مخصوص ہے۔ کچھ کرسیاں بڑے معزز مہمانوں کے لئے رکھی ہیں۔ غیر ملکوں کے سفیر ایک الگ کونے میں بیٹھتے ہیں۔ اور بی بی سی کے نمائندوں کو صدر کے بالکل سامنے کی چند کرسیاں ملی ہیں۔

جب میں اپنی جگہ پر پہنچا ہوں تو پارلیمنٹ کا اجلاس شروع ہوچکا تھا۔ اور ممبر وزیروں سے سوال پوچھ رہے تھے۔ ان سوالوں میں عام طور سے دلچسپی نہیں لی جاتی۔ کبھی کبھی کوئی ممبر گورنمنٹ پر فقرہ کس دیتا تھا تو سب ہنس پڑتے تھے۔ میں نے چاروں طرف نظریں

دوڑاکر لوگوں کو دیکھنا شروع کیا۔ صدر کے دائیں بازو پر گورنمنٹ کے ممبر بیٹھے تھے۔ اور پہلی قطار صرف وزیروں کے لئے تھی۔ برطانیہ کے وزیروں کی تصویریں دیکھتے دیکھتے اب انہیں پہچاننا مشکل نہیں رہا مسٹر ہیوٹن۔ سر جان اینڈرسن۔ مسٹر اٹیلی۔ سر کنگزلے وڈ۔ مسٹر ایمرے سر جیمز گرگ۔ اور بہت سے وزیروں کو میں نے ایک نظر میں پہچان لیا لیکن آج اس برات کے دولھا سر اسٹافرڈ کرپس تھے۔ یہ وزیروں کے درمیان گھرے بیٹھے تھے۔ اور سب کی نظریں انہی پر پڑ رہی تھیں۔

وزیروں کے سامنے ایک بہت بڑی میز رکھی تھی۔ اور میز کے اُس طرف گورنمنٹ کی مخالف پارٹی کے ممبر بیٹھا کرتے ہیں۔ ان میں سے بھی اکثر شکلیں جانی پہچانی نظر آئیں۔ تھوڑی دیر میں مسٹر لائڈ جارج بھی مخالف پارٹی میں آن کر بیٹھ گئے۔ ان کے سفید بکھرے ہوئے بڑے بڑے بال۔ سیاہ فیتے کی عینک۔ اور بڑی بڑی سفید مونچھیں انھیں دنیا میں کون نہیں جانتا۔

تماشائیوں کی گیلری میں آج اسقدر ہجوم تھا کہ کہیں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی۔ لیڈی ولنگڈن۔ مسز ایمرے۔ اور لیڈی کرپس پاس پاس بیٹھی تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ ہندستان کے ماضی حال۔ اور مستقبل کا ان تینوں عورتوں سے کسقدر گہرا تعلق ہے۔ ان کے

برابر لارڈ ہیلی بیٹھے تھے۔ غیر ملکی سفیروں کی گیلری میں روس کے سفیر موسیو میاسکی کو میں نے دور سے ہی پہچان لیا۔ ان کے برابر لارڈ سائمن۔ اور سابق وزیر ہند لارڈ زٹ لینڈ کی کرسیاں تھیں۔ اتنے میں وزیر ہند کے تینوں ہندستانی مشیر سر حسان سہروردی۔ سر آتول چندر چیٹرجی۔ اور دیوان بہادر رنگھاناتن بھی آن کر بیٹھ گئے۔ اور ان کے پاس ہی ہندستان کے نئے ہائی کمشنر سر عزیز الحق بھی کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔

نیچے ہال کمرے میں پہلے تو بہت سی بنچیں خالی تھیں۔ مگر بارہ بجتے بجتے سارا کمرہ ممبروں سے بھر گیا۔ ممبروں میں صرف تین فوج کی وردی میں تھے۔ چار عورتیں تھیں۔ باقی کے سب ممبروں کی عمر بہت کافی معلوم ہوتی تھی۔ ہر ایک ممبر کے ہاتھ میں ہندستان کے متعلق وائٹ پیپر تھا۔ اور سب کی نظر گھنٹے کی طرف تھی۔ بارہ بجکر پانچ منٹ پر کرپس بولنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اور ان کے کھڑے ہوتے ہی سب نے بہت زور سے تالیاں بجائیں۔ جب انہوں نے تقریر شروع کی ہے تو پارلیمنٹ میں غضب کی خاموشی تھی۔ اور سب ممبر تصویر بنے ان کی تقریر سن رہے تھے۔ ان کی گرجدار آواز اور نپے ہوئے فقروں نے سب پر جادو کا سا اثر کیا۔ اور پورے ایک گھنٹے تک ساری پارلیمنٹ ان کی تقریر بہت غور سے سنتی رہی۔ جب انہوں نے کہا

کہ ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات پر ہم بہت سے اعتراض کرسکتے ہیں، مگر اسوقت ہمیں حال اور مستقبل پر غور کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ماضی پر رائے دینا تاریخ کا کام ہے۔ تو اس پر سب نے بہت زور سے تالیاں بجائیں۔ ان کی تقریر تو لکھی ہوئی سامنے تھی۔ مگر یہ کبھی کبھی اسے دیکھ لیتے تھے۔ ورنہ ساری تقریر انہوں نے کاغذ کے بغیر کی۔ کرپس کا لمبا قد سُبک جسم متین اور سنجیدہ چہرہ۔ ایک ایک لفظ میں صداقت اور سچائی۔ اور بار بار اپنے دونوں ہاتھوں سے میز کو دبانا۔ ان سب باتوں کا سننے والوں پر بہت اچھا اثر ہوا۔ ایک گھنٹے تک بولنے کے باوجود ان کی آواز یا لہجے پر تھکن کا کوئی اثر نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہاں ان کی بیرسٹری نے مدد کی۔ کرپس کے بیٹھتے ہی پارلیمنٹ خالی ہونی شروع ہوگئی۔ اور صرف گنتی کے چند ممبر رہ گئے۔ مگر بحث جاری رہی۔ مخالف پارٹی کی طرف سے ایک ممبر نے بولنا شروع کیا۔ لیکن گورنمنٹ کی طرف سے صرف وزیر ہند اور کرپس یہ تقریر سُن رہے تھے۔

میں نے پارلیمنٹ سے باہر نکلتے ہی اخبار والے کو چلاّتے سُنا کرپس کی پارلیمنٹ میں ہندوستان پر تقریر پڑھیئے۔ آج کا تازہ پرچہ +

۲۷ر اپریل ۱۹۴۲ء

ہاؤس آف لارڈز

ہاؤس آف کامنز اور ہاؤس آف لارڈز میں وہی فرق ہے جو مغل بادشاہوں کے زمانے میں دربارِ عام اور دربار خاص میں ہوا کرتا تھا۔ ہاؤس آف کامنز میں ووٹ دینے والے اپنے نمائندے چن کر بھیجتے ہیں۔ مگر ہاؤس آف لارڈز کے ممبر صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں کہ جنہیں ڈیوک، یا لارڈ کا خطاب میراث میں ملا ہے۔ ہاؤس آف کامنز میں جانے کا اتفاق مجھے کئی بار ہو چکا ہے۔ لیکن اب تک ہاؤس آف لارڈز کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن یہ حسرت بھی کل پوری ہو گئی۔

ہاؤس آف لارڈز کے ممبر تو پانسو سے زیادہ ہیں۔ لیکن عام طور سے اس کے جلسوں میں مشکل سے پچاس ساٹھ لارڈ برابر شریک ہوتے ہیں۔ بہت سے بڑے بڑے کمروں، غلام گردشوں اور دالانوں میں سے گذرتا ہوا میں خاص اُس کمرے کے سامنے پہنچ گیا کہ جہاں برطانیہ کے ڈیوک اور لارڈ جمع ہو کر مشورے کرتے ہیں۔ میرے ساتھ اندرا دیوی

بھی تھیں۔ انھیں ایک افسر نے روک کر نہایت ادب سے کہا کہ ہاؤس آف لارڈز میں ننگے سر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے اگر اور کچھ نہیں تو اپنے سر پر رومال باندھ لیجئے۔ اندرا دیوی کے پاس کوئی اتنا بڑا رومال نہیں تھا کہ سر پر باندھ لیتیں۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ایک چپراسی نے کہیں سے ایک پرانی کپڑے کی سیاہ ٹوپی لاکر دے دی یہ انہوں نے اپنے سر پر پہن لی۔ اور اب ہم دربار خاص میں داخل ہو گئے

ابھی جلسہ شروع نہیں ہوا تھا۔ ہم گیلری میں بیٹھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہاؤس آف لارڈز کی خالی سرخ بانات سے منڈھی ہوئی بنچوں کو دیکھ رہے تھے کہ دروازے میں سے وزیر ہند مسٹر ایمرے داخل ہوئے یہ ہاؤس آف کامنز کے ممبر ہیں اس لئے یہ بھی ہماری طرح تماشائی کی حیثیت سے آئے تھے۔ مسٹر ایمرے چاہتے تھے کہ کمرے میں سے گذر کر دوسرے کونے میں تماشائیوں کی گیلری میں بیٹھ جائیں۔ ابھی انہوں نے کمرے کے اندر قدم ہی رکھا تھا کہ ایک ملازم نے وزیر ہند مسٹر ایمرے کو روک دیا۔ اور کہا کہ اس کمرے میں لارڈ چانسلر کا سنہری عصا رکھا ہے۔ اور دستور کے مطابق جب یہ عصا کمرے میں رکھا ہو تو کوئی غیر کمرے میں سے گذر نہیں سکتا۔ اس لئے آپ دوسرے دروازے سے کمرے کے اس کونے تک جا سکتے ہیں۔

ہاؤس آف لارڈز کا قانون اپنی جگہ پر اٹل ہے وزیر ہند ہوں یا وزیر اعظم۔ سب کو یہ قانون ماننا پڑتا ہے۔ چنانچہ مسٹر ایمری نے چکر کاٹ کر دوسرے دروازے سے کمرے میں آئے۔ اور چپ چاپ بادشاہ سلامت کے تخت کی سیڑھیوں کے سہارے آلتی پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گئے۔

اب برطانیہ کے لارڈ۔ ڈیوک اور بڑے بڑے نواب وغیرہ کمرے میں داخل ہوئے۔ اور ان کے بعد ہاؤس آف لارڈز کے چانسلر لارڈ سائمن آئے وہی سر جان سائمن جو سائمن کمیشن کے ساتھ ہندوستان گئے تھے۔ یہ اپنی ایک خاص کرسی پر سب کو جھک کر سلام کرنے کے بعد جا بیٹھے۔ ان کی کرسی کو صدر کی کرسی نہیں کہا جاتا بلکہ اسے انگریزی میں روئی کی بوری کہتے ہیں۔ خدا جانے اسے روئی کی بوری کیوں کہا جاتا ہے۔ شاید کسی زمانے میں واقعی لارڈ چانسلر روئی کے بورے پر بیٹھ کر صدارت کرتے ہوں گے۔

جب سب بیٹھ گئے تو میں نے غور سے سب کو دیکھنا شروع کیا ہاؤس آف کامنز کے ممبروں میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ لیکن ہاؤس آف لارڈز میں کوئی عورت ممبر نہیں ہوسکتی۔ دوسرا فرق مجھے یہ نظر آیا۔ کہ ہاؤس آف کامنز میں ممبروں کا لباس بہت سادہ اور معمولی ہوتا ہے بلکہ مزدور پارٹی کے ممبر تو پھٹے پرانے لباس ہی میں چلے آتے ہیں لیکن

یہ تمام لارڈ اور نواب نہایت عمدہ سیاہ سوٹ اور سفید کالر کی قمیضیں پہنے ہوئے تھے۔ ایک آدھ لارڈ اپنے لباس کی طرف سے کچھ بے فکر سا نظر آتا تھا۔ ورنہ سب کے کپڑے نہایت عمدہ تھے ؛

تیسری بات میں نے یہ دیکھی کہ ممبروں میں سے ۸۰ فیصدی ساٹھ سال سے زیادہ عمر کے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ سب نوجوان لارڈ اور نواب فوج میں بھرتی ہو چکے ہیں ؛

ہاؤس آف کامنز میں جب بحث ہوتی ہے تو ممبر اکثر جوش میں آجاتے ہیں۔ اور مخالف پارٹی کے ممبر وزیروں پر بہت زور شور سے سوال کرتے ہیں۔ کبھی کبھی غصے میں تیز فقرے بھی سننے میں آجاتے ہیں۔ مگر کل کی بحث سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ ہاؤس آف لارڈز میں یہ گرما گرمی دیکھنے میں نہیں آتی۔ جب کوئی لارڈ کسی دوسرے لارڈ کا ذکر کرتا ہے تو نہایت ادب سے۔ دوسرے لارڈ کو عالی مرتبہ یا خاندانی نواب کے خطاب سے یاد کرتا ہے۔ البتہ یہاں تقریریں بہت بلند پائے کی ہوتی ہیں۔ ہر ایک لارڈ تقریر کرنے سے پہلے اس مضمون کو خوب سمجھ لیتا ہے۔ اس کے متعلق ہر طرح کی معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ اور کوئی بات ایسی نہیں کہتا کہ جسے واقعات سے صحیح ثابت نہ کیا جاسکے۔

ہاؤس آف لارڈز میں کل ہندستان پر بحث ہوئی تھی۔ اور اس

سلسلے میں جتنی بھی تقریریں ہوئیں ان سب سے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ بولنے والوں نے نہایت محنت سے اپنی تقریریں تیار کی تھیں۔ گورنمنٹ کی طرف سے نائب وزیرِ ہند ڈیوک آف ڈیون شائر بولنے والے تھے۔ مگر بدقسمتی سے یہ وقت پر جلسے میں پہنچ نہیں سکے۔ اس پر سب کو بہت حیرت ہوئی آخر بہت دیر بعد یہ ہانپتے کانپتے کمرے میں داخل ہوئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک سیاہ رنگ کا چھوٹا سا بکس ایک چپراسی لے ان کے سامنے لاکر رکھا۔ یہ سرکاری کاغذات کا بکس انڈیا آفس سے ان کے لئے آیا تھا۔ اس کی مُہر انہوں نے توڑی۔ اور جیب سے ایک بڑی سی چابی نکالکر اسے کھولا۔ اب انہوں نے تقریر شروع کی۔ یہ تقریر کر رہے تھے اور زمین پر بیٹھے وزیر ہند مسٹر ایمری ٹکٹکی باندھے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۴۲ء

پارلیمنٹ میں مسٹر چرچل کی تقریر

جون ۴۲ء میں جب جنرل رومل کا لشکر برطانی فوجوں کو ریلتا ہوا تو برق سے مصر کی سرحد کے اندر لے آیا تو تمام سلطنت میں ایک آگ سی لگ گئی اخباروں نے گورنمنٹ اور فوجی افسروں کے خلاف مضمون لکھے، پارلیمنٹ میں تقریریں ہوئیں۔ اُس وقت مسٹر چرچل تیسری دفعہ مسٹر روزولٹ سے مشورہ کرنے کے لئے امریکا گئے تھے۔ پارلیمنٹ کے چند ممبروں نے گورنمنٹ کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پیش کر دی۔ اور اس بات پر زور دیا کہ مسٹر چرچل فوراً امریکہ سے واپس آکر اس بحث میں حصہ لیں۔ چنانچہ مسٹر چرچل ہوائی جہاز کے ذریعے لندن واپس آئے اور یکم جولائی سے یہ تاریخی بحث پارلیمنٹ میں شروع ہوئی۔ اسّی گھنٹے تک دونوں طرف سے تقریریں ہوتی رہیں۔ اور آخر ۲ر جولائی کو مسٹر چرچل نے اپنے مخالفوں کو ایسا جواب دیا کہ ساری بازی پلٹ گئی۔

میں ابھی چند منٹ ہوئے پارلیمنٹ کی بحث سُن کر آیا ہوں۔ جب سے

اس بحث کا اعلان ہوا تھا لندن کیا بلکہ تمام دنیا میں لوگ اس کا بہت بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ کل دن بھر گورمنٹ کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پر بحث ہوتی رہی۔ اور رات کے ڈھائی بجے تک پارلیمنٹ کے ممبر دونوں طرف کی زوردار تقریریں سنتے رہے۔ اور آج صبح پھر اُدھر پارلیمنٹ میں تقریریں ہو رہی تھیں اور اِدھر لندن کے اخبار منٹ منٹ کی خبریں چھاپ چھاپ کر بانٹ رہے تھے۔ جیسا کہ آپ خبروں میں سُن چکے ہیں۔ یہ بحث مصر اور سنگاپور کی لڑائی پر ہو رہی ہے جوں جوں مصر کے میدان جنگ میں دشمن کے اسکندریہ کی طرف بڑھنے کی خبریں چلی آتی ہیں اسی قدر اس بحث میں لوگوں کی دلچسپی اور پارلیمنٹ کے ممبروں کا جوش بڑھتا چلا جاتا ہے۔ آج صبح جب میں پارلیمنٹ کی بحث سننے کے لئے گیا تو ہزاروں آدمی ہاؤس آف کامنز کے سامنے سڑک پر کھڑے وزیروں اور ممبروں کے آنے جانے کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ پارلیمنٹ کی عمارت کے اندر تماشائیوں کا اتنا ہجوم تھا کہ بہت سے لوگوں کو گیلری میں جگہ نہیں ملی اور مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے بہت سے ہندستانی سپاہی بھی یہ تماشہ دیکھنے کے لئے ایک جگہ کھڑے تھے۔ ان کے ایک افسران کے رہبر تھے۔ اور جب کوئی وزیر یا پارلیمنٹ کا بڑا ممبر سامنے

سے گذرتا تھا یہ افسر انہیں اسکا نام بتا دیتے تھے۔

پارلیمنٹ کے ہال کمرے میں آج تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ مشکل یہ ہے کہ ممبر زیادہ ہیں اور پارلیمنٹ میں ان سب کے لئے کافی جگہ نہیں، اس لئے بہت سے ممبر دروازے میں کھڑے تھے۔ اور کچھ ممبر صدر کے تخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ صدر کے دائیں ہاتھ پر پہلی صف میں وزیر بیٹھتے ہیں۔ آج وزیر بھی سب ہی آ گئے تھے۔ اس لئے بہت سے وزیروں کو کھڑا رہنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد مسٹر چرچل کمرے میں داخل ہوئے۔ اس وقت ممبر سوال پوچھ رہے تھے لیکن مسٹر چرچل کے آتے ہی سب نے خوب تالیاں بجائیں۔

مسٹر چرچل سیاہ سوٹ پہنے۔ کالی بو لگائے نہایت خاموشی سے پہلی صف میں سر اسٹافرڈ کرپس کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے مسٹر چرچل کو کئی بار دیکھا ہے۔ اور بارہا ان کی تصویریں بھی دیکھی ہیں لیکن جسقدر سنجیدگی اور متانت آج ان کے چہرے سے ٹپکتی تھی۔ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ مسٹر چرچل کے پارلیمنٹ میں پہنچتے ہی تمام ممبروں میں ایک نئی جان سی پڑ گئی۔ سوالوں کے بعد ایک ممبر نے گورنمنٹ کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پڑھ کر سنائی۔ اور مزدور پارٹی کے ایک ممبر نے تقریر شروع کی اس وقت تمام پارلیمنٹ پر حد درجے کی خاموشی طاری تھی۔ ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ موقع کی نزاکت سے سب خوب واقف ہیں۔ اور آج اپنی کمزوری اور طاقت کو ترازو کی تول تولنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ مزدور پارٹی کے ممبر نے بھی ایسے صاف صاف الفاظ میں گورنمنٹ اور مسٹر چرچل پر اعتراض کئے کہ ان کی صاف گوئی اور دیانت کو سب ممبروں نے تالیاں بجاکر قبول کیا۔ پارلیمنٹ میں موافق اور مخالف بہت سی تقریریں ہوئیں لیکن ایک بات صاف طور سے ظاہر تھی کہ سب ممبر فتح حاصل کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اور آج تمام دنیا کو یہ دکھا دینا چاہتے ہیں کہ برطانی قوم میں کسی قسم کی پھوٹ یا نا اتفاقی نہیں بلکہ یہ جمہوریت کا کمال ہے کہ آج پارلیمنٹ میں ہر ایک ممبر کو گورنمنٹ کے خلاف ہر قسم کا اعتراض کرنے کی اجازت ہے۔ میں نے اسکا مقابلہ ڈکٹیٹروں کی حکومت سے کیا اور اپنے دل سے پوچھا۔ کیا اُن ملکوں کے رہنے والے اپنے حاکموں سے اس طرح کُھلم کُھلا بازپرس کرسکتے ہیں؟

پارلیمنٹ میں بحث ابھی تک جاری ہے۔ میں صرف چند منٹ کے لئے آپ کو وہاں کا آنکھوں دیکھا حال سنانے کے لئے چلا آیا تھا۔ سب سے آخر میں مسٹر چرچل کی تقریر ہوگی۔ اور تمام دنیا کو اسی تقریر کا سب سے زیادہ انتظار ہے۔ ہاؤس آف کامنز کے اندر پارلیمنٹ کے ممبر اور لندن سے لے کر دلّی تک ہمارے سننے والے اسی تقریر کے

انتظار میں کان لگائے بیٹھے ہیں۔

(۲)

چاروں طرف اوپر گیلری میں تماشائیوں کا ہجوم۔ نیچے ہال کمرے میں کھچا کھچ ممبر بھرے ہوئے۔ مخالف تقریروں سے ہاؤس آف کامنز کی فضا میں ایک عجیب قسم کی بے چینی! وزیروں کے چہروں پر ایک خاص سنجیدگی۔ ممبروں میں جوش اور تماشائیوں کے دلوں میں دھڑکن۔ اِن سب باتوں کو اپنے ذہن میں جما لیجئے۔ اور پھر مسٹر چرچل کی طرف دیکھئے۔ آج سب کی نظریں مسٹر چرچل کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ یہ نہایت وقار سے اٹھے اور میز کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اِن کے ہاتھ میں بہت سے چھوٹے چھوٹے سفید کاغذ کے ورق تھے۔ کہ جن پر ان کی تقریر کے نوٹ لکھے ہوئے تھے۔ میز پر ایک صندوق رکھا تھا۔ مسٹر چرچل نے صندوق کے اوپر یہ کاغذ رکھ دئیے۔ اور عینک لگا کر ممبروں کی طرف دیکھا۔ اسوقت پارلیمنٹ میں ایک عجیب پُراثر فضا تھی۔ ایک طرف مسٹر چرچل کے خلاف اعتراضوں کا اثر۔ اور دوسری طرف مسٹر چرچل کی زبردست شخصیت اور ان کے کارناموں کی تاثیر، ترازو کے دونوں پلڑے برابر تھے۔ اور اب یہ مسٹر چرچل کی تقریر پر منحصر تھا کہ ترازو کا پلہ کسطرف جھکتا ہے۔

نہایت بلند آواز میں مسٹر چرچل نے تقریر شروع کی ہو قع کی نزاکت سے یہ خوب واقف تھے۔ اعتراض کرنے والوں کی ایک ایک بات ان کے ذہن میں تھی۔ کوئی اور معمولی انسان ہوتا تو اس زبردست بوجھ کے نیچے دب کر رہ جاتا۔ لیکن چرچل ایسے ایسے خدا جانے کتنے معرکے اپنی زندگی میں دیکھ چکے ہیں۔ آج یہ ہاؤس آف کامنز میں اپنی صفائی پیش کرنے آئے تھے۔ ان پر اور ان کی گورنمنٹ کے خلاف زبردست الزام تھا۔ لیکن مسٹر چرچل سے بہتر صفائی میں کون بحث کر سکتا تھا۔ تماشائیوں کی گیلری میں مسز چرچل اور اُن کی سب سے چھوٹی بیٹی بیٹھی یہ سب تماشہ دیکھ رہی تھیں خدا جانے اِن دونوں کے دلوں کی کیا حالت ہو گی۔ لیکن جب مسٹر چرچل نے تقریر شروع کی۔ تو یہ دونوں آگے کٹھرے پر جُھک گئیں۔ سُنا ہے کہ ہمیشہ تقریر کرنے سے پہلے مسٹر چرچل اپنی تقریر کی مشق مسز چرچل کے سامنے کر لیتے ہیں اور مسز چرچل انہیں تقریر کے بارے میں مشورے بھی دیتی ہیں۔ چنانچہ آج کی تقریر میں مسز چرچل کا بھی حصہ تھا۔

مسٹر چرچل اپنے سننے والوں کی نبض شناسی میں بہت بڑے ماہر ہیں۔ اور یہی بات ان کی تقریروں کو کامیاب کرتی ہے۔ انہوں نے ایک گھنٹے کے اندر تمام سننے والوں کو ایسا ہاتھ میں لیا کہ وہی لوگ

جو پہلے ان پر اعتراضوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ اب مسٹر چرچل کی تقریر پر تالیاں بجانے لگے۔ پارلیمنٹ کا رنگ دیکھتے دیکھتے بدل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی جادوگر سب کے سامنے گلاس کے پانی کا رنگ بدل رہا ہے۔ اور لوگ حیران ہیں۔ یہ جدھر چاہتے تھے سننے والوں کو پھیر دیتے تھے۔ کبھی لوگ ان کے چبھتے ہوئے فقروں پر ہنستے تھے۔ اور کبھی ان کے ساتھ مل کر واقعات کی نزاکت پر غور کرتے تھے۔

برابر ڈیڑھ گھنٹے تک تقریر کرنے کے بعد تحسین و آفرین کے نعروں کے درمیان مسٹر چرچل اپنی جگہ پر بیٹھے اور ممبروں نے عدم اعتماد کی تجویز پر ووٹ دینے شروع کئے۔ ایک دروازے سے مسٹر چرچل کے حمایتی گذر رہے تھے۔ اور دوسرا دروازہ ان کے مخالفوں کے لئے تھا۔ مجھے تو سب مسٹر چرچل کی حمایت میں بڑھتے نظر آئے۔ اس دروازے میں سے نکلنے کی جگہ بھی نہ ملتی تھی۔ اور ان کے مخالف دروازے میں سے کوئی گذرنے والا نہیں تھا۔

آخر پارلیمنٹ میں اعلان ہوا کہ ۴۷۵ ممبروں نے مسٹر چرچل کے حق میں رائے دی اور صرف ۲۵ ممبران کے مخالف نکلے۔ گویا ساڑھے چار سو ووٹوں کی کثرت سے گورنمنٹ کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز رد ہو گئی۔

(یہ تقریر پارلیمنٹ میں لکھی گئی تھی)

لارڈ وِلنگڈن کا جنازہ

میں ابھی لارڈ ولنگڈن کو دفن کرنے کی رسم میں شرکت کر کے آیا ہوں یوں تو بہت سی خوشی اور غمی کی رسمیں مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لیکن جو متانت سنجیدگی اور دبدبہ میں نے آج اپنی آنکھوں سے دیکھا اسکی یاد ایک مُدّت تک میرے دل میں باقی رہے گی۔

ویسٹ منسٹر کے تاریخی گرجا میں برطانیہ کے اُن سپوتوں کو دفن کیا جاتا ہے کہ جن پر انگریز قوم فخر کر سکتی ہے۔ انگلستان کے بڑے بڑے شہنشاہ۔ ادیب۔ شاعر۔ انشا پرداز۔ سیاست داں اور جرنیل سب اسی گرجا میں دفن ہیں۔ جسے اس گرجا میں جگہ مل جائے سمجھ لیجئے کہ اس نے شہرتِ عام پر بقائے دوام کی مُہر لگا دی۔ اور اس کا نام برطانیہ کے سپوتوں کی فہرست میں درج ہو گیا۔ لارڈ ولنگڈن نے بھی اسقدر عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں کہ ان کے ویسٹ منسٹر میں دفن ہونے کو تمام سلطنت نے پسند کیا۔

آج صبح سے ہی تماشائیوں کا ہجوم ویسٹ منسٹر کے سامنے جمع تھا۔ بارہ بجے سے پہلے گرجا کے بڑے ہال کمرے میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ بادشاہ سلامت کے خاص نمائندے سلطنت کے وزیر۔ بڑے بڑے نواب۔ اور لارڈ۔ ان کی بیویاں۔ فوجی افسر۔ دوسرے ملکوں کے سفیر۔ اور لارڈ ولنگٹن کے دوست اس رسم میں شریک ہونے کے لئے جمع تھے۔ گرجا کے اندر قدیم طرز کی بلند محرابیں۔ منقش شیشے۔ اور ان میں سے چھن چھن کر سورج کی روشنی۔ ایک عجب روحانی مجلس کا سا سماں بندھ گیا۔ مجمع اگرچہ ہزاروں کا تھا لیکن گرجا میں بالکل خاموشی۔ ہر شخص سیاہ لباس پہنے ہوئے کمرے کے اس سرے پر قربان گاہ اور اس کے سامنے جھلملاتی ہوئی کافوری شمعیں۔ جگہ جگہ سیاہ وردیاں پہنے فراش لوگوں کو راستہ دکھا رہے تھے جنھیں بیٹھنے کی جگہ نہ ملی وہ کھڑے ہو گئے۔ ٹھیک سوا بارہ بجے آرگن باجے نے ہلکے سروں میں ایک ایسا دلدوز نغمہ چھیڑا کہ سب کے کان اُدھر لگ گئے۔ اب دروازے میں سے جلوس داخل ہوا۔ آگے برطانیہ کے بڑے بڑے پادری سرخ وسیاہ لبادہ پہنے۔ اُن کے پیچھے دوسرے پادری قطار باندھے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ان کے بعد ایک پادری صلیب کا سنہری نشان لئے آ رہا تھا۔ صلیب کے

نیچے برطانیہ کے سب سے بڑے لاٹ پادری آرچ بشپ آف کنٹربری تھے۔ ان کے بعد سیاہ لباس پہنے آٹھ آدمی لارڈ ولنگڈن کے جنازے کو کندھا دیتے ہوئے لائے۔ جنازہ بکس کے اندر بند تھا۔ اور اس پر نہایت سادی سفید ریشمی چادر پڑی تھی۔ چادر پر سنہری روپہلی تاروں سے صلیب کا نشان کڑھا ہوا تھا۔ اور اس کے اوپر ہلکے سُرخ اور سبز رنگ کے پھولوں کا گلدستہ رکھا تھا۔ جنازے کے دونوں طرف دائیں بائیں سلطنت برطانیہ اور شہنشاہ کے آٹھ نمائندے آہستہ آہستہ سر جھکائے چل رہے تھے۔ اِن میں تیسرے نمبر پر ہندستان کے ہائی کمشنر سر فیروز خاں نون ہلکا جوگیہ رنگ کا صافہ باندھے ہندستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ آرگن کے نغموں کے سُروں پر جنازہ صدر دروازے سے جا کر قربان گاہ کے سامنے رُک گیا۔ اب پادری صاحب نے دعا مانگی۔ سب ماتم دار سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ پادری صاحب نے انجیل مقدس کی یہ عبارت پڑھی۔

"بے شک ہم اس دنیا میں خالی ہاتھ آئے ہیں اور خالی ہاتھ جائیں گے۔ صرف خدا ہی کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔"

یہ دعا کچھ اس درد سے پڑھی گئی کہ سننے والوں کے دل ہل گئے۔ اس کے بعد سب نے مل کر حمد کے کئی مقدس گیت گائے۔ اور آخر جنازہ اٹھا کر قبر تک لے گئے

جب جنازہ قبر میں اُتار اگیا تو آرچ بشپ نے دعا پڑھی ؛

" آج ہم اپنے اِس بھائی کو خاک کے سپرد کرتے ہیں۔ یہ خاک کا پُتلا تھا۔ اب خاک میں مل رہا ہے۔ اِسکا خمیر مٹی سے بنا تھا اب مٹی میں مل رہا ہے۔ اے خداوند یسوع مسیح اس کی روح کو اپنی رحمت میں جگہ دے "؛

سارے مجمع نے آمین کہا۔ اور جس طرح جلوس آہستہ آہستہ اندر آیا تھا اسی طرح باہر نکل گیا۔ جلوس کے نکلتے ہی مجمع بکھر گیا۔ باہر ہزاروں تماشائی کھڑے تھے۔ اخبار نویس تصویریں لے رہے تھے۔ سینما والے فلم بنا رہے تھے۔ ہر شخص کی زبان پر لارڈ ولنگڈن کا ذکر تھا۔ لیکن میری آنکھوں کے سامنے دلّی کی وائسریگل لاج تھی کہ جہاں سے اُنہوں نے پانچ سال حکومت کی۔ ان کے دربار کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ شملے میں مشوبرے جاتے وقت ان کا مُسکراتا چہرہ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ اور مجھے وہ وقت بھی یاد تھا کہ جب سنہ ۳۶ء میں نئی دلّی کے ریلوے اسٹیشن سے یہ آخری دفعہ رخصت ہوئے ہیں۔ اور لوگوں نے تالیاں بجا کر اِنہیں الوداع کہی ہے تو بہت دیر تک یہ کھڑے ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کے سلام کا جواب دیتے رہے ؛

۲۰ اگست سنہ ۴۱ء

لارڈ ویول

انڈیا آفس میں ایک کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور وزیر ہند کے پرائیویٹ سکریٹری نے اس کے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ چھوٹا سا صاف ستھرا کمرہ اس میں بڑی سی میز۔ اور میز کے سامنے لارڈ ویول بیٹھے ہیں۔ انہوں نے مسکرا کر مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اور اپنے سامنے والی آرام کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر بولے۔ آپ یہاں کب سے ہیں، اور کیسے انگلستان آئے تھے۔ میں نے لندن یونیورسٹی اور بی بی سی کا ذکر کیا۔ اور اپنے مطلب کی بات کہہ دی۔ وہ بات یہ تھی کہ ایک سال سے میں ہندستانی بچوں کے لئے بی۔ بی سی سے ایک خاص پروگرام براڈکاسٹ کرتا ہوں۔ جسے تمام ہندستان کے بچے بہت شوق سے سنتے ہیں۔ اور آج انھیں بچوں سے آپ کی ملاقات کرانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

لارڈ ویول غیر فوجی لباس پہنے بیٹھے تھے۔ اور میری سب باتوں کو بہت غور سے سن رہے تھے۔ بولے۔ مجھے ریڈیو سے بہت دلچسپی ہے

اور مجھے یقین ہے کہ ہندستان میں ریڈیو کے ذریعے بہت سا لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ مجھ سے انہوں نے پوچھا کہ آپ بچوں کو اور کیا کیا باتیں سناتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ہندستان میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں کی اوسط سو میں مشکل سے بارہ نکلے گی اور ہماری اکثر مصیبتوں کا باعث یہی جہالت ہے۔ اب ہندستان کے بچوں نے جہالت کے مورچے پر حملہ شروع کیا ہے۔ اور ہر صوبے کے بچے اپنے خالی وقت میں کسی نہ کسی کو پڑھاتے ہیں۔ لارڈ ویول نے بچوں کے اس کام کو بہت شوق سے سنا۔ اور کہا کہ بے شک یہ نہایت نیک کام ہے ہندستان میں ہمیں اعلیٰ تعلیم سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ عام لوگوں کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنا دیا جائے۔ تاکہ گاؤں گاؤں تعلیم اور ہنر کا چرچا ہو۔ لوگ اچھی اچھی باتیں سیکھیں۔ اپنے فائدے کے کام کریں۔ اور اس طرح سارے ملک کی بھلائی ہو جائے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ لوگ گاؤں چھوڑ کر شہر کی زندگی کی طرف کھنچے چلے آئیں کیونکہ تعلیم کا چرچا ہونے کے بعد جو سہولتیں اور آرام شہر میں میسر ہیں۔ یہی گاؤں والے خود حاصل کر سکتے ہیں۔ لارڈ ویول نے کہا۔ اپنے سننے والے بچوں سے میری طرف سے کہہ دیجئے کہ جہالت کے مورچے پر اسی تندہی سے کام کئے جائیے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہندستانی

بچے مل کر اس مشکل مہم کو سر کر لیں گے۔ اس پر انہوں نے ایک بہت دلچسپ قصہ بھی سنایا۔ آج سے کوئی تین چالیس سال پہلے لارڈ ویول فوج میں ایک معمولی افسر کی حیثیت سے ہندوستان گئے تھے۔ اور اُس زمانے میں راولپنڈی سے کشمیر تک لوگ تانگوں میں جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ تانگے میں بیٹھے کشمیر جا رہے تھے کہ سڑک کے کنارے تانگے والے نے تانگہ روک کر گھوڑے بدلے۔ وہیں ایک ہندوستانی نوجوان ہاتھ میں انگریزی کتاب لئے بیٹھا تھا۔ انھیں دیکھتے ہی یہ نوجوان لپک کر ان کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا کہ مجھے اس انگریزی کتاب میں سے چھ لفظ پڑھا دیجئے۔ لارڈ ویول نے اسے چھ لفظوں کا تلفظ اور اُن کے معنی بتا دیئے۔ اور تعجب سے پوچھا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ اُس نوجوان نے کہا۔ میں ہر روز اپنی کتاب لے کر یہاں سڑک کے کنارے آن بیٹھتا ہوں۔ جب کوئی انگریز یہاں سے گذرتا ہے۔ اُس سے چھ لفظ پڑھوا کر سُن لیتا ہوں۔ اور دیکھئے اس طرح میں نے یہ کتاب پڑھ لی ۔

لارڈ ویول نے کہا۔ اس نوجوان ہندوستانی کی ہمت اور اُس کا ارادہ دیکھئے کہ اُس نے بغیر کسی استاد کے اپنے شوق سے کیسے ایک غیر ملکی زبان سیکھ لی۔ اسی طرح اگر دوسرے ہندوستانی ہمت کریں تو یقیناً یہ بھی لکھنا پڑھنا بہت آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔

باتوں باتوں میں میں نے پوچھا کہ آپ ہندوستان فلسطین۔ مصر روس اور فرانس غرض دنیا بھر کے ملکوں میں کام کر چکے ہیں۔ زبانیں تو آپ کو بہت سی آتی ہونگی۔ بولے۔ قدرت نے مجھے زبان دانی کا ملکہ نہیں دیا۔ لیکن ہندوستان میں میں نے اُردو اور پشتو میں ہائی پرافیشنسی کا امتحان پاس کیا تھا۔ اور پشاور کے مشہور منشی خان بہادر احمد جان سے میں نے یہ زبانیں سیکھی تھیں۔ اس کے بعد ایک کتاب میں سے چند اُردو کے فقرے میں نے پڑھ کر سنائے۔ تو واقعی یہ اُردو خوب سمجھ لیتے ہیں۔ یہ روس گئے تو وہاں روسی زبان سیکھ لی۔ اس میں یہ خوب بات چیت کر سکتے ہیں لیکن عربی انہوں نے نہیں سیکھی۔ البتہ فرانسیسی میں انہیں خوب مہارت ہے ؛

معلوم ہوا کہ لارڈ ویول کی ایک لڑکی اِسوقت ملک شام میں ریڈ کراس کے ساتھ نرسوں کا کام کر رہی ہے۔ دو لڑکیاں ہندستان کے ہیڈکوارٹر میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ اور ان کا لڑکا ہندستان میں میجر ہے غرض سارا خاندان اس وقت اپنے ملک کی خدمت کر رہا ہے ؛

ہوائی حملوں کا ذکر آیا تو میں نے کہا کہ ہندستانی بچے بہت شوق سے ہوائی حملے سے بچاؤ کے کاموں میں حصہ لے رہے ہیں۔ اور ان کے خطوط سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ اگر خدا نہ کرے کبھی وقت پڑا تو لندن

کے بچّوں کی طرح ہندستانی بچے بھی بہادری میں کم نہیں نکلیں گے۔

لارڈ ویول نے کہا۔ جب کلکتے پر جاپانیوں نے بم برسائے تھے تو میں بم زدہ علاقے کو دیکھنے کے لئے گیا تھا۔ اس دورے سے مجھے اندازہ ہوا کہ ہندستانی دشمن کے بموں کا مقابلہ کرنے کے لئے کس ہمّت سے کام لے رہے ہیں۔ مجھے کہیں پریشانی نظر نہیں آئی۔ اس پر مجھے ان کی تقریر کا وہ حصّہ یاد آگیا جس میں انہوں نے کہا تھا:

"ہم دشمن سے لڑنے کے لئے بہت سے ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے سب سے بڑا ہتھیار لوگوں کی ہمت اور ان کا حوصلہ ہے۔"

غرض کوئی آدھ گھنٹے تک ہندستان کے نئے وائسرائے سے اس قسم کی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ اور میں نے اس ملاقات میں ایک بات کا اندازہ لگایا۔ اب تک لڑائی کے ہر مورچے پر جہاں کہیں گھمسان کا رن پڑا فیلڈ مارشل ویول اپنے سپاہیوں کے ساتھ اگلی صف میں خود جا موجود ہوئے۔ چنانچہ لیبیا۔ سنگھا پور۔ جاوا سماٹرا اور برما کے مورچوں پر دُکھ اور سُکھ میں ہر وقت یہ اپنے سپاہیوں کے شریک حال رہے۔ آج میں نے دیکھا کہ ہندستان کی ہر بات میں لارڈ ویول اسی طرح دلچسپی لے رہے تھے جیسے یہ خود ہندستان کے

دیہات میں بیٹھے ہیں۔ ہماری تعلیمی گتھیوں کو سمجھ کر سلجھا رہے ہیں۔ ایک ایک بات کُرید کُرید کر پوچھ رہے ہیں۔ اور یہ ان کے عجیب و غریب دل و دماغ کا ایک ہلکا سا نمونہ ہے۔ جو ہندستان کے لئے میں ایک بہت نیک شگون سمجھتا ہوں۔

۲۹ر جون ۱۹۴۳ء

جرمن قیدیوں کا جہاز

ستمبر سنہ ۴۱ء میں جرمن اور برطانی حکومتوں نے زخمی اور ناکارہ قیدی اپنے اپنے ملک کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس خبر سے انگلستان میں لوگ بہت خوش ہوئے۔ جرمن قیدیوں کو واپس بھیجنے کے لئے نیوہیون کی بندرگاہ پر پہنچا دیا گیا۔ اور اُدھر برطانی قیدی فرانس کے ساحل تک آ گئے۔ جہاز چلنے کے لئے تیار تھے کہ ایکا ایکی خدا جانے کیونکر یہ تجویز رُک گئی۔ اور قیدیوں کی ادلا بدلی نہیں ہو سکی۔

تجویز ختم ہونے سے پہلے بہت سے اخبار نویس قیدیوں کو دیکھنے کے لئے گئے تھے۔ اور بی بی سی کی طرف سے مجھے وہاں بھیجا گیا تھا:

انگلستان کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ پر بیٹھا میں یہ چند فقرے لکھ رہا ہوں۔ میرے سامنے دو ہسپتال کے جہاز کھڑے ہیں۔ یہ دونوں جہاز جرمن قیدیوں کو لے کر فرانس جانے والے ہیں۔ اور فرانس سے ان کے بدلے میں برطانی قیدی اسی بندرگاہ پر لائے جائیں گے۔

جرمن قیدی آج تین چار دن سے ان جہازوں پر سوار ہیں۔

لڑائی کی وجہ سے اس بندرگاہ کے آس پاس کئی کئی میل تک عام لوگوں کو آنے کی اجازت نہیں۔ وزیر جنگ کے دفتر سے بی بی سی اور اخباروں کے نمائندوں کو خاص طور سے یہاں آنے کے لئے پاس ملے ہیں۔ اور ہم سب آج دو دن سے یہاں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔

جرمن قیدیوں کی آسائش اور آرام کا بہت عمدہ انتظام ہے اگرچہ یہ سب جہاز کے نیچے والے حصے میں رہتے ہیں لیکن ہر روز انہیں بندرگاہ پر اُتر کر ورزش کرنے کی اجازت ہے۔ ان میں سے بعض قیدی بے حد بیمار ہیں۔ ان کے علاج اور ان کی نگرانی کے لئے ڈاکٹر اور نرسیں موجود ہیں۔ جرمن قیدیوں کو ریڈیو سننے کی تو اجازت نہیں لیکن یہ ہر وقت جرمن ریکارڈ بجا کر۔ تاش کھیل کر، یا ہنس بول کر اپنا جی بہلاتے رہتے ہیں۔

ہمارے دونوں جہازوں پر بڑے بڑے لال رنگ کے صلیب کے نشان ہیں۔ اور جہازوں پر سفید رنگ پھرا ہوا ہے۔ تاکہ دور سے ہسپتال کے جہاز نظر آجائیں۔ ان پر دن رات سپاہی پہرہ دیتے رہتے ہیں۔ جہاز کی چمنی میں سے ہلکا ہلکا دھواں نکلتا رہتا ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ جہاز ہر وقت چلنے کے لئے تیار ہیں۔ حکم ملتے ہی

روانہ ہوجائیں گے۔ بلکہ دونوں جہازوں کا رُخ فرانس کے ساحل کی طرف ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے زیادہ پانی میں یہ جہاز بے چین ہیں۔ کہ کب جرمن گورنمنٹ کا فیصلہ ہو اور کب ہم ملیں۔

ہمارے زخمی سپاہی جب جرمنی سے یہاں پہنچیں گے تو انھیں ہر قسم کی چیزیں تیار ملیں گی۔ اِن کے استقبال کی بہت دھوم دھام سے تیاریاں ہو رہی ہیں۔

اگرچہ نیوہیون چھوٹا سا قصبہ ہے۔ لیکن یہاں کے رہنے والوں نے فوجی باجہ منگوایا ہے۔ زخمی سپاہیوں کے لئے پھول کئی دن سے پانی میں رکھے ہیں کہ مرجھا نہ جائیں۔ بچے رنگ برنگ کی جھنڈیاں تیار کر رہے ہیں۔ ابھی تک سپاہیوں کے نام معلوم نہیں ہوئے۔ اس لئے انگلستان میں آج رات ہزاروں گھر بے چین ملیں گے۔ بہت سی مائیں خدا سے دعا مانگ رہی ہیں کہ اِن قیدیوں میں ہمارا لڑکا بھی آجائے۔

ایک اخبار میں آج چھپا تھا کہ ایک عورت کے خاوند کی جرمنی میں ٹانگ کٹنے کی خبر آئی تھی۔ اس عورت کو یقین ہے کہ میرا خاوند بھی ان زخمی سپاہیوں کے ساتھ جرمنی سے آرہا ہے۔ اِس عورت نے تو یہاں تک کہدیا۔ بلا سے اس کی دونوں ٹانگیں کٹ جائیں۔ لیکن یہ اپنے گھر واپس آجائے۔

عام طور پر اخبار نویسوں کو جہازوں کے پاس جانے کی اجازت نہیں۔ لیکن آج تیسرے پہر ہمیں خاص طور سے جہازوں کے سامنے لے جا کر سارا انتظام دکھایا گیا تھا۔ اِن جہازوں پر اسوقت سپاہیوں اور نرسوں کو مشق کرائی جا رہی تھی۔ کہ جب برطانی زخمی سپاہی جرمنی سے یہاں آئیں تو انہیں کیسے اتار کر ٹرین میں پہنچایا جائے۔

جہاز کے سامنے ہسپتال کی دو ٹرینیں کھڑی ہیں۔ میں نے سرکاری اجازت لے کر یہ ٹرینیں بھی دیکھ لیں۔ اس ٹرین کے سب سے بڑے افسر کرنل صاحب ۱۸ سال تک ہندستان میں رہ چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے ماتحت ایک میجر صاحب کے سپرد مجھے کر دیا۔ اور انہوں نے مجھے ساری ٹرین کی سیر کرائی۔ اس ٹرین میں زخمی سپاہیوں کو لے جانے کے لئے بہترین قسم کا انتظام ہے۔ ایک ایک ٹرین میں ۲۶۰ زخمی سپاہی لے جائے جا سکتے ہیں۔ ہر ایک مریض کے لئے نہایت آرام دہ چھوٹا سا بستر ہے بستر کے علاوہ معقول دواخانہ۔ کھانے کا کمرہ غرض ایک چلتا پھرتا ہسپتال سمجھئے۔ نہایت سخت قسم کے مریضوں کے لئے الگ کمرے ہیں۔ جو زخمی سپاہی چل پھر سکتے ہیں اُن کے آرام کے لئے ایک چھوٹا سا کمرہ الگ ہے۔ کھانے پینے کے لئے سب چیزیں ٹرین میں موجود ہیں۔ اندر ہی سب گاڑیوں میں آنے جانے کا راستہ ہے

ساری ٹرین ایک فرلانگ لمبی ہے۔ اور اس خوبی سے بنائی گئی ہے
کہ پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر بیٹھے تو کیا مجال کہ گلاس چھلک جائے
بندرگاہ پر سپاہی آجا رہے ہیں۔ اخباروں کے نمائندے
ٹہل رہے ہیں۔ برطانی سپاہیوں کے لئے پھل۔ سگرٹ۔ چاکلیٹ
اور کھانے پینے کا سامان گاڑیوں میں بھرا موجود ہے۔ سینما والے
کیمرے لئے تیار ہیں۔ اور تمام دنیا کے کان اسوقت اس چھوٹی سی
بندرگاہ کی طرف لگے ہوئے ہیں۔

۱۴ ستمبر

رائل آرٹ گیلری

ایک تو لندن جیسا پُر رونق شہر۔ اور پھر ٹرے فیل گر سکوئر کی چہل پہل۔ سر بفلک ستون پر نیلسن کا بُت۔ ایک طرف چیرنگ کراس، اسکے برابر سٹرینڈ کا بازار، وائٹ ہال میں بڑے بڑے سرکاری دفتر۔ یہ سب نقشہ اپنے ذہن میں جما لیجئے۔ اور اب اس چوراہے پر کھڑے ہو کر دو منٹ سیر کیجئے۔ چوراہے کے بیچوں بیچ لوگوں کے بیٹھنے کے لئے بنچ۔ پانی سے چھلکتے ہوئے تالاب۔ اور تالاب کے گرد رنگ برنگ اور قسم قسم کے سینکڑوں کبوتر۔ یہ کبوتر ہیں تو جنگلی لیکن ایسے سدھ گئے ہیں کہ بے تکلف لوگوں کے ہاتھ پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ دوپہر کے وقت بیسیوں بچے۔ عورتیں، مرد انہیں دانہ کھلانے آتے ہیں۔ اور کبوتر ہاتھ کی ہتھیلی پر سے آکر چگ لیتے ہیں۔ اس چوراہے کے سامنے ایک بہت بڑی عمارت میں برطانیہ کی مشہور نیشنل آرٹ گیلری ہے۔ جو تقریباً سو سال سے دنیا بھر کے آرٹ اور مصوّری کے شیدائیوں کا مرکز بنی

ہوئی ہے جس مصوّر کی بنائی ہوئی تصویر ایک دفعہ اِس آرٹ گیلری میں لٹک جائے سمجھ لیجئے کہ اسے معراج مل گئی۔ اور اب دنیا میں اس مصوّر کے لئے اس سے بڑا اور کوئی دوسرا انعام نہیں ہو سکتا۔

جنگ سے پہلے ہر سال لندن کی نیشنل آرٹ گیلری میں دنیا کی بہترین تصویروں کی نمائش ہوتی تھی۔ لیکن جب سے لڑائی چھڑی ہے آرٹ اور مصوّری کے نادر نمونے حفاظت سے تہ خانوں میں بند کر دیئے گئے۔ اور ان کی جگہ آجکل اس گیلری میں لڑائی کے زمانے کی مصوّری کے نمونے دکھائے جا رہے ہیں، چنانچہ آج آپ کو انہی جنگی تصویروں کی سیر کراتا ہوں۔

سیڑھیوں پر چڑھتے ہی بہت بڑا ہال ہے۔ اور اس ہال کے دائیں بازو والے کمروں میں آج کل جنگی آرٹ کی تصویریں دکھائی جا رہی ہیں برآمدے میں گھستے ہی سب سے پہلے دو قد آدم تصویروں پر نظر پڑتی ہے۔ اور دونوں تصویریں ہندستانی افسروں کی ہیں۔ ایک تصویر میں میجر محمد اکبر خاں صاحب ہندستانی فوج کی وردی پہنے۔ صافہ باندھے کھڑے ہیں۔ اور دوسری تصویر میں میجر اٹل ننگے سر ایک میز کے سہرے پر بیٹھے ہیں۔

مصوّروں نے یہ دونوں تصویریں بہت عمدہ بنائی ہیں۔ اور ایسا

معلوم ہوتا ہے کہ ابھی یہ دونوں ہندستانی افسر بولنے لگیں گے۔ اِن کے برابر جنرل آکن لیک کی تصویر لٹک رہی ہے۔ اندر بڑے کمرے میں جائیے تو سینکڑوں تصویریں ملیں گی۔ اِن تمام تصویروں کا موضوع جنگ ہے۔ کہیں توپوں سے آگ برس رہی ہے کسی تصویر میں ہمارے ہوائی جہاز دشمن کے ہوائی جہازوں سے لڑ رہے ہیں۔ کہیں بموں سے لندن کے مکان گر رہے پڑے ہیں۔ ایک تصویر میں ہمارے جنگی جہاز ایک بندرگاہ پر لنگر ڈالے کھڑے ہیں۔ ایک کمرے میں صرف اُن بہادروں کی تصویریں لگائی گئی ہیں جنہوں نے اِس جنگ میں بڑے بڑے شاندار کارنامے دکھا کر اپنا نام روشن کیا ہے۔ غرض جنگ کے زمانے میں زندگی کا کوئی پہلو باقی نہیں بچا کہ جس کی مصوّروں نے تصویر کھینچکر یہاں نہ بھیجی ہو ۔

جب یہ جنگ ختم ہو جائے گی۔ تو اسکا ذکر صرف لوگوں کی زبان پر رہجائیگا۔ یا پھر کتابوں اور اخباروں کے پُرانے فائلوں میں اس جنگ کے واقعات افسانے نظر آئیں گے جس طرح جنگ ایک نیا ادب ایک نیا لٹریچر اور ایک نئی زبان پیدا کر رہی ہے۔ اِسی طرح جنگ نے مصوّری اور نقاشی کا رُخ بھی بدل دیا۔ نیشنل آرٹ گیلری کی تصویریں مصوّری کے اِس نئے دَور کا آئینہ ہیں۔ آئندہ کا مورّخ جب تاریخ

لکھنے بیٹھے گا تو اخباروں کے فائلوں۔ سرکاری دستاویزوں۔ اور کتابوں سے زیادہ اسے ان تصویروں سے مدد ملے گی۔ مورّخ اِن تصویروں کو دیکھ کر بتا سکیگا کہ جب لندن پر بموں کی آگ برس رہی تھی تو لوگ راتوں کو زمیں دوز ریل کے اسٹیشنوں پر کیسے سوتے تھے۔ جب گھروں میں آگ لگ جاتی تھی تو اُس وقت کیسا بھیانک منظر نظر آتا تھا

اس نمائش کی دو تصویریں میں تمام عمر نہیں بھول سکتا۔ ایک تصویر میں موقلم مصوّر نے ڈنکرک سے برطانی سپاہیوں کی واپسی کا نقشہ کھینچا ہے۔ سمندر کا کنارہ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا ساحل۔ ساحل پر ہماری فوجیں جہازوں کے انتظار میں کھڑی ہیں۔ سامنے سمندر میں جہاز کھڑے ہیں۔ ان پر ہمارے سپاہی بیٹھنے والے ہیں۔ کہ اتنے میں دشمن کے بمبار سر پر آن پہنچے۔ آسمان سے بموں کی بارش ہو رہی ہے زمین پر جگہ جگہ بموں سے غار پڑ گئے۔ اِن غاروں میں سپاہیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔ کچھ زخمی زمین پر تڑپ رہے ہیں۔ جس کو جہاں سر چھپانے کا ٹھکانہ ملا وہاں چھپ گیا۔ کیسا مصیبت کا وقت تھا۔ جن لوگوں نے اس واقعہ کو صرف خبروں کے ساتھ پڑھا ہو شاید ڈنکرک کا نام بھول جائیں۔ لیکن اِس مصوّر نے ڈنکرک کا نام ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔

اس کے برابر ہی ایک چھوٹی سی تصویر لٹک رہی ہے لیکن بے حد پُراثر۔ چند لاشوں پر کپڑا پڑا ہے۔ اور یہ لاشیں سمندر کے کنارے سنسان میدان میں پڑی ہیں۔ تصویر کا نام ہے: "وہ جنہیں ہم ڈنکرک میں چھوڑ آئے"

سپاہی کی موت کا اس سے زیادہ دلدوز نوحہ کاغذ کے سینے پر مصوّر کا قلم نہیں کھینچ سکتا۔

۸ر اکتوبر ۴۱ء

ایک گولہ

دھائیں دھائیں توپیں چلنی شروع ہو گئیں۔ پورے آٹھ بجے سے جرمن ہوائی جہاز ہمارے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ بہت دور کبھی کبھی بم پھٹنے کی آواز بھی آجاتی تھی۔ ہمارے مکان پر سے زائیں زائیں دشمن کے سیٹی والے بم گذر رہے تھے۔ کھڑکی کا پردہ ہم نے شام سے ہی کھینچ لیا تھا۔ اور لمپ پر کاغذ لگا کر روشنی بہت مدھم کر لی تھی۔ ہم تینوں کمرے میں اپنے اپنے پلنگ پر لیٹے تھے۔ اگرچہ گنجائش اس کمرے میں دس بارہ چارپائیوں کی تھی لیکن ابھی اور لوگ رہنے کے لئے نہیں آئے تھے اس لئے سارے کمرے پر ہمارا ہی راج تھا۔ میں کمرے کے ایک سرے پر تھا۔ پنڈت جی اور سیٹھی دوسرے کونے میں لیٹے تھے۔ یکایک قریب ہی ایک بم آکر پھٹا۔ سارا کمرہ ہل گیا۔ جیسے زلزلہ آگیا۔ کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر زمین پر پٹاخ سے گرا

کہتے ہیں جب آدمی مصیبت میں ہو تو اُسے کوئی اور بات سوچنی چاہیئے دُکھ کم ہو جاتا ہے۔ میں کمبلوں میں دبکا اپنی جماعت اور شاگردوں کا نقشہ

ذہن میں جما رہا تھا۔ کتنے شریر لڑکے ہیں۔ شوخ آنکھوں سے ذہانت ٹپکی پڑتی ہے۔ برج بہار کبھی گھر کا کام کر کے نہیں لاتا۔ لیکن میرے آنے سے پہلے بلیک بورڈ صاف کرنے لگتا ہے کہ شاید میں اس کی محنت اور تن دہی دیکھ کر گھر کا کام نہ مانگوں۔ بھلا میں کب چھوڑتا ہوں۔ میں آتے ہی سب سے پہلے اس سے گھر کا کام مانگتا ہوں۔ جماعت ہنس پڑتی ہے۔ برج بہار جھینپ کر بیٹھ جاتا ہے۔ میں یہ سوچ کر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کہ کمرے کے پرلے سرے سے سیٹھی نے دبکی ہوئی آواز میں کہا "پنڈت جی۔ کل میں اپنا نیا سوٹ پہنوں گا۔"

پنڈت جی نے نہایت بے اعتنائی سے جواب دیا "کیوں کل کیا خاص بات ہے۔ پرسوں کیوں نہیں پہنو گے؟"

اس جواب پر جیسے سیٹھی کا دل ٹوٹ گیا۔ اُس نے زور سے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ توپ کے گولوں کے دھماکوں میں سیٹھی کی آہ ایسی معلوم ہوئی جیسے خزاں کے موسم میں ہوا سے پتے کھڑکھڑا جائیں۔

کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی۔ شاید سیٹھی سوچ رہا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ پنڈت جی سوٹ پہننے کے بارے میں پھر سوال کریں گے۔ لیکن خدا جانے اس وقت پنڈت جی کو سیٹھی کے نئے سوٹ میں دلچسپی کیوں نہیں تھی۔ جب بہت دیر گذر گئی اور پنڈت جی پھر بھی نہ بولے تو سیٹھی نے

کہا۔ "پنڈت جی کتنی میٹھی ہے"

پنڈت جی نے جیسے چونک کر کہا۔ "کہاں میٹھی ہے کمبخت ایک چمچہ پکر لیتے ہیں۔ وہ بھی پورا نہیں"

سیٹھی کے دل کو ٹھیس سی لگی۔ بھنّا کر کہا۔ "میں ایمی کا ذکر کر رہا تھا پنڈت جی"۔

پنڈت جی نے معذرت کے لہجے میں کہا۔ "ارے میں سمجھا تم چائے کا ذکر کر رہے ہو"

سیٹھی نے دبی آواز میں کہا۔ "آج رات کلب سے اُس کے ساتھ میں گھر تک آیا تھا"

سیٹھی کے اس فقرے میں بچوں کا سا غرور چھپا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا پنڈت جی اس بات کو سُن کر حیران ہو جائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی بچے کو بہت اونچے سے پھلانگتے دیکھ کر بڑے حیرت میں رہ جاتے ہیں۔ لیکن پنڈت جی اب بھی خاموش تھے۔ برابر سے ہوا مار توپ دھائیں سے چلی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے بالکل سر پر گولہ آن گرے گا۔ سیٹھی اپنے بستر سے نکل کر پنڈت جی کے بستر پر جا پہنچا۔ سیٹھی نے پنڈت جی کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "پنڈت جی۔ میں اندھیرے میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلا"

پنڈت جی نے ہنکارا بھرا۔ سیٹھی کی اُمید کا ٹمٹماتا ہوا دیا جیسے بھڑک اٹھا "پنڈت جی میں نے اُس سے پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے، اُس نے مسکرا کر کہا ایمی"

پنڈت جی رومانس کی نسبت واقعیت کے زیادہ شیدائی تھے، بولے۔ "بالکل غلط۔ اندھیرے میں تم اس کی مسکراہٹ کیسے دیکھ سکتے تھے؟ البتہ اگر وہ ہنسی ہو تو اور بات ہے۔ اور اگر وہ ہنسی تو اس کی ہنسی میں یقیناً طنز کا پہلو زیادہ شامل ہوگا"

سیٹھی نے زچ ہو کر کہا: "اچھا مان لو وہ مسکرائی نہیں لیکن اس نے کہا میرا نام ایمی ہے۔ پنڈت جی۔ ایمی!"

پنڈت جی بولے: "پھر؟"

سیٹھی چاہتا تھا کہ پنڈت جی اس لفظ کی اہمیت سے واقف ہو جائیں اس لئے تشریح کرتے ہوئے بولا: "پنڈت جی ولایت میں ہر ایک لڑکی کے دو نام ہوتے ہیں۔ ایک اُسکا اپنا، ایک خاندان کا۔ عام طور پر لڑکی غیروں کو اپنے خاندان کا نام بتاتی ہے لیکن جب وہ کسی کی بیحد عزیز ہو جائے تو پھر اپنا، بس صرف اپنا نام بتاتی ہے۔ سمجھے آپ؟"

پنڈت جی بولے: "پھر؟"

اب سیٹھی سے نہ رہا گیا۔ بولا: "پنڈت جی۔ اگر آپ میں ذرا بھی شعور ہے تو سمجھ لیجئے کہ ایمی مجھے چاہتی ہے"

پنڈت جی بہت بے پروائی سے بولے: "اچھا تو پھر؟"

سیٹھی نے پنڈت جی کے سرد سینے میں جذبات ٹٹولنے کی ایک بار

پھر کوشش کی "پنڈت جی آج سے میں نے اپنا زندگی کا پروگرام بدل لیا ہے۔ صبح سویرے اٹھا کرونگا۔ روز شیو (Shave) کرونگا۔ نیا سوٹ پہنونگا اُسے روز استری کرونگا تاکہ اس کا شکن تلوار کی دھار کی طرح تیز رہے بالوں میں کنگھی اور برش بھی دن میں کئی بار کرتا رہونگا۔ شام کو اپنی کے ساتھ سیر کو جایا کرونگا۔ اشرف میرا دوست ہے، اور مجھے یقین ہے کہ اگر میں نے اشرف سے چھڑی مانگی تو اشرف انکار نہیں کرے گا۔ بھلا دوستوں میں چھڑی بھی کوئی چیز ہے۔ مجھے اشرف کی چھڑی بہت پسند ہے۔ چھڑی لے کر چلنے میں انسان کا رعب بڑھ جاتا ہے۔ سڑک پر چلنے والے عزت کرتے ہیں۔ یہ بھی کوئی سیر ہے کہ خالی ہاتھ چلے جا رہے ہیں۔ چھڑی ہو تو کبھی اُسے گھمایا۔ کبھی گھماتے گھماتے کوئی فطرت کا منظر نظر آیا تو چھڑی ایک خاص زاویئے سے ہوا میں معلق رہ گئی۔ اور سیٹی بجاتے بجاتے منہ صفر کا ہندسہ بنا رہا۔ پھر اس منظر کو ایک خاص انداز سے دیکھا، اور آگے بڑھ گئے۔ اب میں ورزش بھی کرونگا۔ پھر میری صحت دیکھنا۔ سمجھے پنڈت جی سیٹھی نے عاجزانہ لہجے میں کہا" پنڈت جی کل آپ کی چھٹی کا دن ہے۔ ذرا میری ٹائی پر استری کر دیجئے گا۔"

پنڈت جی نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا "بھئی اب مجھے نیند آرہی ہے۔ سونے دو۔ کل صبح مجھے جلدی اُٹھنا ہے۔ میں سائیکل پر ایک دوست

کے ساتھ جارہا ہوں۔ وہ میرا سات بجے ڈاک خانے کے پاس انتظار کرے گی۔"

سیٹھی نے بہت دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا "پنڈت جی۔ یہ دوست کون ہے۔اس لڑکی کا کیا نام ہے؟"

پنڈت جی شاید کچھ سو سے گئے تھے، بولے "بھئی پورا نام تو یاد نہیں رہا۔ مگر ہاں سائمن ہے۔"

سیٹھی نے پنڈت جی کا شانہ جھنجوڑتے ہوئے کہا "پنڈت جی ایمی سائمن تو نہیں ہے؟ ایمی سائمن تو نہیں ہے؟" پنڈت جی کبھی کے سو چکے تھے۔

سیٹھی سیدھا اپنے بستر پہ جا کر لیٹ گیا۔ اور خدا سے دعا مانگنے لگا۔ اے مالک ایک گولہ! صرف ایک گولہ! آج ہمیں بھی مل جائے۔ پھٹنے والا نہ سہی۔ اگن بم ہی سہی۔ تیرے خزانے میں کس چیز کی کمی ہے۔

توپیں دھائیں دھائیں چل رہی تھیں۔ گولے بھی برس رہے تھے۔ لیکن —— دُور —— بہت دُور۔

کتوبر سنہ ۴۰ء

لندن سے آداب عرض

لڑائی کا زمانہ۔ ہر چیز کی قلّت۔ ہر بات میں کفایت۔ تنگی تُرشی سے گذارہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ پہلے میں کمرے میں تنہا رہا کرتا تھا۔ اب ایک کمرے میں ہم چار دوست رہتے ہیں۔ پلنگ دو ہیں لیکن دو منزلہ، اس طرح چار بستروں کی جگہ نکل آئی۔ بالائی منزل والے نے ذرا کروٹ لی تو زیریں منزل کا بستر خود بخود ہل گیا۔ نیچے کی منزل والا کسمسایا تو اوپر والے کی آنکھ کھُل گئی۔ رات کو آسمان پر ہوائی جہاز اور ان کے پیچھے پیچھے اندھیرے آسمان پر بجلی کی لمبی لمبی شعاعیں جیسے پتلی پتلی انگلیاں آسمان کا سینہ چیر رہی ہوں۔ خدا جانے ہمارے ہوائی جہاز ہیں یا دشمن کے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ہوائی خطرے کے سائرن بھی بجتے ہیں۔ کبھی زور سے بموں کے دھماکے بھی سنائی دیتے ہیں، ان سے کھڑکیوں کے شیشے جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ پچھلے سال ہوائی خطرے کا اعلان سنتے ہی سب پریشان ہو جاتے تھے۔ بھاگے بھاگے پناہ خانوں میں

پہنچ جاتے تھے لیکن ایک سال کی بم باری نے اب عادی سا بنا دیا ہے بم بھی گریں تو کوئی پرواہ نہیں کرتا، ایک مساوات سی ہوگئی ہے۔ آج کل ہماری رات خیریت سے کٹ جاتی ہے۔ صبح میری چھوٹی سی ٹائم پیس سُریلی آوازمیں گھنٹی بجاتی ہے۔ دہرہ دون سے چلتے وقت میرے شاگردوں نے یہ گھڑی مجھے تحفے کے طور پر دی تھی افریقیہ کے مغربی ساحل پر سے جب میرا جہاز گزر رہا تھا تو ایک رات یہ فرش پر گری اور اسکا شیشہ ٹوٹ گیا میں نے دل میں کہا۔ جب تک ہندستان واپس نہیں جاؤنگا۔ اس کا شیشہ نہیں لگواؤنگا۔ چنانچہ آج بھی اس کے شیشے میں بال پڑا ہوا ہے۔ میرے پلنگ کے بالکل پاس ریڈیو سٹ رکھا ہے۔ آٹھ بجے آنکھیں بند کیئے کیئے اس کی گھنڈی گھما دی۔ آٹھ بجے صبح کی خبریں سُنیں۔ اندازہ ہوگیا کہ رات بھر دنیا میں کیا ہوا۔ لڑائی کے زمانے میں انسان کو خبروں سے کس قدر دلچسپی ہو جاتی ہے۔ ایک ہی خبر بار بار سنتے ہیں۔ اخباروں میں پڑھتے ہیں اپنی بحث کرتے ہیں لیکن پھر بھی جی نہیں بھرتا۔ ابھی میرے تینوں دوست سو رہے ہیں۔ جلدی جلدی حجامت بنائی۔ مُنہ دھویا۔ اب ریڈیو پر امریکہ اور اسٹریلیا کا پروگرام چل رہا ہے۔ امریکی لہجے میں خبریں۔ ناچ کے نغمے۔ گانے۔ لطیفے تقریریں کمرے سے نکلتے ہی باہر سیڑھیوں پر خادمہ نظر آئی۔ سفید لباس پہنے فرش صاف کر رہی ہے۔ یہ اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی ہے۔ عجیب لہجے میں انگریزی بولتی ہے۔ اسکا کام مکان کی صفائی ہے۔ اس لیئے میں اسے مہترانی

کہتا ہوں۔ خادمہ نے گڈ مارننگ کہا۔ اور ایک سانس میں موسم کی تفصیل سنا دی
اس کی زبانی مجھے رات بھر کے موسم کا حال اور صبح کی موسمی خبریں مل جاتی ہیں
اس ملک میں ہر بات موسم سے شروع ہوتی ہے اور موسم پر ختم ہوتی ہے
ہندستان میں اگر ہمارے پاس گفتگو کا کوئی موضوع نہ ہو تو دوسروں کی غیبت
یا بُرائیاں کر کے وقت کاٹتے ہیں۔ انگلستان میں اگر وقت کاٹنا ہو تو موسم کا
ذکر چھیڑ دیا لیجئے ان کا کام شروع ہو گیا۔ مکان میں اور بھی بہت سے لوگ رہتے
ہیں سب ہمارے ہی دفتر میں کام کرتے ہیں لیکن بہت سے ابھی سو رہے
ہیں۔ شاید رات کو چار بجے تک کام کر کے آئے ہیں۔ کھانے کے کمرے
میں دو چار مرد عورتیں اور بھی بیٹھی ہیں۔ کالا لباس پہنے خادمہ جلدی جلدی ناشتہ
لا رہی ہے۔ سردی میں گرم گرم چائے۔ چاہے اس میں شکر کم ہی کیوں نہ ہو
جسم میں جان سی ڈال دیتی ہے۔ کمرے میں کھانے کی کئی میزیں لگی ہوئی ہیں
سامنے میز پر ایک سوئڈن کے رہنے والے بیٹھے ہیں۔ سنا ہے کہ کسی زمانے
میں ٹینس کے بین الاقوامی کھلاڑی تھے لیکن اب بیماری کی وجہ سے صرف
تبرک بن کر رہ گئے ہیں۔ جب دیکھو چائے کی ایک پیالی لئے گھنٹوں اس
کی چُسکیاں لگاتے رہتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔ آج کی تازہ خبریں
سُنیں میں نے خبروں کا خلاصہ سنا دیا۔ اُنہوں نے ایک ایک بات کو بہت
غور سے سُنا۔ اور پھر مکھن کی ایک بہت چھوٹی سی مقدار کو بہت بڑے

توس پر اس طرح پھیلانے لگے کہ کم سے کم مکھن زیادہ سے زیادہ ڈبل روٹی پر پھیل جائے۔ ان کے برابر دوسری میز پر ایک روسی یہودی بیٹھے ہیں۔ چین بھی ہو آئے ہیں۔ ان کی نگاہیں عام طور پر عینک کے شیشوں کے اوپر سے دیکھتی ہیں۔ غالباً انہیں خطرہ ہے کہ اگر عینک کے شیشوں میں سے دیکھیں تو بہت ممکن ہے کہ شیشے کثرتِ استعمال سے گھس جائیں گے میری پُشت والی میز پر دو عورتیں ہمیشہ اسی جگہ بیٹھتی ہیں۔ ایک کا قد لمبا ہے اور موزوں جسم، دوسری کا جسم بھدّا ہے اور چھوٹا۔ اگر ناشتے کے ساتھ انڈا ملے تو بہت شوق سے کھاتی ہیں۔ لیکن مچھلی دیکھتے ہی فوراً نہایت پھرتی سے اپنے کوٹ سنبھالتی۔ بٹوے ہاتھ میں لئے کمرے سے باہر نکل جاتی ہیں

ناشتہ ختم ہوا۔ میں ایک بار اپنے کمرے میں پھر گیا۔ دو دوست بستر سے باہر نکل چکے ہیں، اور تیسرے دوست کو باہر نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا اصرار ہے کہ بس اب نکلا۔ ابھی ان کی بحث درمیان ہی میں تھی کہ میں اپنی برساتی لے کمرے سے باہر نکل آیا۔ کمرے میں ریڈیو بج رہا ہے لیکن شاید بحث کی وجہ سے سب اسے بھول چکے ہیں۔ بنگلے کے سامنے سڑک پر ٹھیک اسی وقت دودھ کی موٹر آن کر ٹھہری۔ دو لڑکیاں موٹر میں سے نکلیں۔ دودھ کا بڑا سا برتن دونوں نے پکڑ کر موٹر سے اتارا۔ خدا جانے ہمارے بنگلے میں رہنے والے کتنا دودھ روز پی جاتے ہیں۔

سامنے والے دروازے پر دھوبی کی موٹر کھڑی ہے۔ اس سے آگے قصائی کی موٹر ملی۔ یہاں کنجڑے قصائی دھوبی سب دکاندار موٹریں سامان بھر کر گاہکوں کے ہاں پہنچا دیتے ہیں۔ سڑک کے موڑ پر ایک چھوٹی سی بچی اپنے بھائی کو اسکول جانے پر آمادہ کر رہی ہے۔ بھائی کا جی اسکول جانے کو نہیں چاہتا۔ بہن بہلا پھسلا رہی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ دیکھتے نہیں یہ کس شوق سے قدم اٹھائے مدرسے جا رہے ہیں۔ اپنی تعریف سن کر میرا نفس موٹا ہو گیا۔ میں نے نہایت غرور سے ننھے میاں کی طرف دیکھا اور زیادہ تیزی سے قدم اٹھانے شروع کر دیئے۔

اب میں بڑی سڑک پر پہنچ گیا۔ یہاں سے ہمارا دفتر پورے دو میل ہے۔ سرکاری موٹر بس بھی چلتی ہے۔ لیکن میں صبح کے وقت ہمیشہ پیدل ہی جاتا ہوں۔ برف پڑے یا بارش ہو۔ مجھے صبح پیدل دفتر جانے میں بہت لطف آتا ہے۔ سڑک پر ایک آدھ دکان ابھی کھلی ہے۔ دکان کے دروازے پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہے۔ یہاں سگرٹ نہیں ملتے۔ آجکل اس ملک میں سگرٹوں کی کمی ہے۔ لوگ دکان دار کو بار بار آن کر دِق کرتے تھے اسلئے اس نے اب دروازے پر ہی لکھ کر لگا دیا ہے۔ سڑک پر سامنے سے سائیکل پر سوار ایک لڑکی اخبار اُچھالتی چلی آ رہی ہے۔ پہلے اس کا بڑا بھائی اخبار بانٹا کرتا تھا لیکن جب سے وہ فوج میں بھرتی ہوا ہے۔ یہ کام

اس لڑکی نے اپنے ذمّے لے لیا ہے۔ ہر ایک گھر کے سامنے بغیر سائیکل سے اترے ایسا نشانہ باندھکر اخبار پھینکتی ہے کہ سیدھا دروازے کے اندر جا پڑتا ہے۔ پھر اس کی یادبھی کتنی اچھی ہے۔ جو اخبار جس گھر والے خریدتے ہیں وہی اخبار پھینکتی ہے۔ کیا مجال جو کبھی غلطی کر جائے۔

بڑی سڑک پر دن رات موٹریں چلتی رہتی ہیں۔ آس پاس کے دیہات سے کسان موٹروں میں سبزیاں بھر کر منڈی میں بیچنے کے لئے لاتے ہیں پھلوں کا موسم ہو تو موٹروں پر آلوچے، سیب وغیرہ لاتے ہیں۔ بڑی بڑی فوجی لاریوں میں ہوائی جہاز اور خدا جانے کیا کیا کل پرزے اِدھر اُدھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ کبھی ہسپتال کے موٹر بھی نظر آجاتے ہیں۔ سفید بُراق موٹر۔ ان پر سُرخ صلیب کا بڑا سا نشان۔ موٹریں پردے پڑے ہوئے۔ زن سے موٹر گذر جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے پھُریری سی آجاتی ہے کبھی بڑی بڑی موٹر لاریوں میں بھرے ہوئے سپاہی بھی جاتے ہیں۔ جب کوئی خوبصورت لڑکی سائیکل پر قریب سے گذرتی ہے تو سب سپاہی ایک آواز ہو کر کوئی گیت چھیڑ دیتے ہیں۔ لڑکی ہاتھ ہلا کر سلام کرتی ہے یا جھینپ کر نظریں نیچی کر لیتی ہے۔ سب سپاہی زور سے قہقہہ مارتے ہیں۔

ٹھیک سوا نو بجے مجھے اسی سڑک پر ایک سائیکل سوار لڑکی ملتی ہے یہ ہمارے گاؤں کے ایک سینما میں کام کرتی ہے۔ اسکا کام اندھیرے میں

لوگوں کو جگہ دکھاتا ہے۔ یہ ہر ہفتے مجھے سائیکل پر جاتے جاتے نئے فلموں کا نام بتا جاتی ہے۔ میں اِن فلموں کا ذکر اپنے دوستوں سے کر دیتا ہوں اگرچہ ہمارے گاؤں میں دو سینما ہیں۔ لیکن ہم سب اسی لڑکی کے سینما میں جاتے ہیں۔ کیونکہ دوسرے سینما کی اچھی تصویروں کا ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا، اگر سینما کے منیجر کو یہ بات معلوم ہو جائے تو وہ لڑکی کی تنخواہ ضرور بڑھا دے کہ یہ اشتہار کا کام بھی کرتی ہے۔

اب میں سڑک کے اس مقام پر پہنچ گیا کہ جہاں میرا راستہ کٹ کر بائیں طرف مُڑ جاتا ہے۔ اور بڑی سڑک آگے نکل جاتی ہے۔ اِس راستے کے دونوں طرف سبزیوں ترکاریوں کے کھیت ہیں۔ ان کھیتوں میں موسم کے مطابق مٹر۔ گوبھی۔ آلو۔ گاجریں۔ کدو۔ فرانس بین۔ ککڑیاں کھیرے۔ ٹماٹر بوئے جاتے ہیں۔ اور زمیندار کو ان فصلوں پر بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اگر وقت پر بارش نہ ہو تو بجلی کے فواروں سے بارش کی طرح پانی برسا کر کیاریوں کو سینچتا ہے۔ جب فصلیں تیار ہو جاتی ہیں تو بہت زیادہ مزدوری دے کر عورتوں کو سبزیاں توڑنے کیلئے بلوا تا ہے۔ اِسی لئے ایک کھیرا دس بارہ آنے کو ملتا ہے۔ یہاں بھی آلوچے اور سیبوں کے باغیچے ہیں۔ کھیتوں میں آجکل کُھدائی ہو رہی ہے۔ موٹر کے ہل بھی لڑکیاں چلا رہی ہیں۔ انھیں زمینداری فوج کہتے ہیں۔ ان کی خاکی

برجیں اور سبز رنگ کے گلوبند اونی سوئیٹر دور سے نظر آجاتے ہیں۔ اسوقت یہ لڑکیاں دم لینے کے لئے درختوں کے نیچے بیٹھی ہیں۔ چائے کی بوتلیں اُن کے ہاتھ میں ہیں۔ اور جیب سے ڈبل روٹی کے ٹکڑے نکال نکال کر کھا رہی ہیں۔ میں سڑک کے ساتھ والی پگ ڈنڈی پر جا رہا ہوں۔ اس سڑک پر راستہ بہت کم چلتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی موٹر گذر جاتی ہے۔ اب سڑک ایک پہاڑی پر سے نیچے اُتر رہی ہے۔ سامنے سے ایک بڑھیا اپنے کُتے کو سیر کرا کے واپس آرہی ہے۔ اسکا کتا بہت بڈھا ہے۔ لیکن پُرانا رفیق ہے! اس لئے دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے کتا ہانپ گیا۔ یہ بھی ٹھہر گئی۔ کتا زبان نکالے ہانپ رہا تھا۔ یہ کھڑی اُسے محبت بھری نگاہوں سے تک رہی ہے۔ ایک دن مجھے یہ سڑک پر نہیں ملی۔ دوسرے دن بھی نظر نہیں آئی۔ تیسرے دن میں نے اسے دیکھا تو بہت مغموم تھی اور کالا لباس پہن رکھا تھا میں ٹھہر گیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یونان کی لڑائی میں اُسکا لڑکا مارا گیا۔ خاوند پچھلی لڑائی میں کام آچکا تھا۔ اس روز سے یہ بہت مغموم رہتی ہے۔ اب ہر روز میں اُسے گڈ مارننگ ضرور کہتا ہوں۔

اسی راستے پر ایک آدمی ہمیشہ گھاس کاٹتا رہتا ہے۔ بڑا سا چھرا لئے زور سے ہوا میں ہاتھ پھراتا ہے۔ لمبی لمبی گھاس کٹ کر اس کے سامنے

گر رہی ہے۔ اس آدمی کی دائیں آنکھ پر ہمیشہ گلابی رنگ کی پٹی بندھی رہتی ہے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ روک لیتا ہے اور مسکرا کر بہت زور سے کہتا ہے۔ "گڈ مارننگ گورنر" مجھے اسکا نام معلوم نہیں لیکن میں ہمیشہ گڈ مارننگ جم" کہتا ہوا آگے نکل جاتا ہوں۔ اب میرا راستہ بڑی سڑک سے آن ملا۔ سامنے سے وہ لوگ آرہے ہیں جن کی رات کی ڈیوٹی تھی۔ رات بھر کام کیا ہے۔ اس لئے سب کی آنکھوں میں نیند کا خمار ہے، یہ سب سائیکلوں پر سوار ہیں۔ سڑک پر صرف میں ہی پیدل جا رہا ہوں۔ جب سڑک پر برف جم جاتی ہے تو پاؤں پھسلتا ہے۔ لیکن میں اپنی چھڑی کی مدد سے قدم جماتا پیدل چلا جاتا ہوں۔ سامنے سے آنے والے مردوں کی ڈاڑھیاں بڑھی ہوئی ہیں، ٹائی کی گرہ ڈھیلی ہے، جلدی جلدی قدم مارتے اپنے اپنے گھر جا رہے ہیں۔ دن بھر سوئینگے تیسرے پہر اُٹھیں گے اور رات کے بارہ بجے سے پھر کام شروع کر دینگے لڑکیوں نے پوڈر اور غازے کی مدد سے ہر چند اپنے چہروں کو پُر رونق بنایا ہے لیکن رات بھر جاگنے سے ان کی آنکھیں بھی سُرخ ہیں، جب سے گرمی آئی ہے لڑکیاں بہت ہلکے پُھلکے لباس پہنتی ہیں۔ یہاں سب کو غسل آفتابی کا بہت شوق ہے۔ سورج کی شعاعوں سے جس کا جسم گندمی ہو جائے اس کی سب تعریف کرتے ہیں، اور یہ شوق جنون کی حد تک پہنچ چکا ہے ایک لڑکی ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلا رہی ہے۔ جب سب کی نظریں اسکی

طرف اُٹھتی ہیں تو فوراً ہاتھ ہینڈل پر رکھ لیتی ہے۔

سڑک کے دونوں طرف کھیت ہی کھیت ہیں۔ ایک طرف کھیتوں کے نیچے دریا بہتا ہے۔ دریا کیا ہے ہندُستان کی چھوٹی سی نہر سمجھئے۔ گرمی کے موسم میں تیسرے پہر سے لوگ دریا میں کشتیاں چلاتے ہیں۔ نہاتے ہیں۔ اور بہت سے لوگ شکار کے شوقین کنارے پر بیٹھے اونگتے ہی رہتے ہیں۔ مچھلی کا شکاری چاہے جمنا کے کنارے بیٹھے یا انگلستان کے کسی دریا کے کنارے اس کی شکل اور اوصاف میں فرق نہیں آتا۔ وہی آنکھوں میں دُھندلی سی چمک۔ جُھکی ہوئی گردن اور ڈور پر ہاتھ۔ دریا کے اُس پار پہاڑی ہے۔ اس کی چوٹی پر سے ریل گذرتی ہے۔ کھیتوں میں مزدور عورتیں کام کر رہی ہیں۔ مرد فوج میں بھرتی ہو گئے اس لئے عورتوں سے کام لیا جا رہا ہے۔ ہندُستان کی طرح بہت سے خانہ بدوش قبیلے انگلستان میں بھی آباد ہیں۔ اِن کا لباس اِن کی شکلیں ہندُستانی خانہ بدوشوں سے بہت ملتی جُلتی ہیں۔ ان کی زبان بھی انگریزی نہیں بلکہ ایک خاص بولی ہے۔ کھیتوں کے برابر گھاس کی چراگاہ ہے۔ جب سے گرمی آئی ہے۔ اس میں ایک کاٹ کی بڑی سی گاڑی آن کر لگ گئی ہے اس میں بہت سی لڑکیاں رہتی ہیں۔ گاڑی کے سامنے ان کا سامان پھیلا رہتا ہے۔ چائے کے برتن۔ پٹرول کا چولھا۔ تولئے۔ کمبل۔ نہانے کا

لباس۔ گاڑی کے اندر زیادہ سے زیادہ تین بستروں کی جگہ ہے لیکن ہر وقت یہاں لڑکیوں کا مجمع لگا رہتا ہے۔ کیا کیا جائے۔ لڑائی کا زمانہ ہے ہر چیز کی قلت ہے۔ ہر بات میں کفایت۔ تنگی ترشی سے گذارہ کرنا ہی پڑتا ہے

تیسرے پہر شہر کی سیر کیجئے۔ چھوٹا سا شہر ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یہ بڑا سا گاؤں ہے۔ لیکن ضرورت کی سب چیزیں مل جاتی ہیں۔ بڑے بازار میں کوئی دو سو کے قریب اچھی بڑی بڑی دکانیں ہیں۔ ہندستان کے بڑے بڑے شہروں میں جو نعمت نہ ملے۔ وہ یہاں اس چھوٹے سے شہر میں ملجاتی ہے۔ البتہ جب سے روشنی بند ہوئی ہے دکانوں کی رونق ذرا کم ہوگئی ہے پہلے کپڑے والوں کی دُکان کے سامنے خاصہ مجمع لگا رہتا تھا۔ لندن کی نئی تراشوں کے نمونے دکھائے جاتے تھے۔ اب وہ پہلے جیسی رونق نہیں رہی۔ ہفتے کے دن تیسرے پہر بازار میں بہت چہل پہل رہتی ہے۔ آس پاس کے دیہات سے بھی لوگ خرید و فروخت کے لئے آتے ہیں۔ بڑے بازار میں تو چلنے کو راستہ نہیں ملتا۔ کبھی کبھی اس بازار میں دس بارہ ہندستانی جوان بھی نظر آجاتے ہیں۔ یہ کئی سال سے انگلستان میں رہتے ہیں۔ سب پنجاب کے رہنے والے ہیں، محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے ہیں۔ جب سے جنگ چھڑی ہے اِن کا کاروبار چمک گیا ہے۔ لندن سے چھوٹی موٹی بساط خانے کی چیزیں یہ خرید لاتے ہیں اور پھر

گاؤں گاؤں پھر کر انہیں بیچ دیتے ہیں۔ اس میں اُنہیں کافی پیسے بچ جاتے ہیں۔ انگلستان میں رہتے رہتے اب یہ اپنی زبان بھول رہے ہیں۔ عام طور سے انگریزی زبان بولتے ہیں۔ تعلیم کی کچھ یونہی سی شُدبُد ہے۔ کسی جہاز پر کام کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے۔ مُلک پسند آیا۔ یہیں رہ پڑے۔ مُلکِ خدا تنگ نہیں۔ انہیں کون روک سکتا ہے۔

روز پیدل چلتے چلتے میرا جوتہ گھس گیا۔ نیا تلا لگوانا ہے۔ سامنے ہی چمار کی دُکان ہے۔ ہندستان کے چمار کی دکان نہ سمجھئے۔ انگریزی چمار کی دُکان ہے۔ دُکان کے باہر شیشے کی الماری میں مرمّت کئے چمکدار جوتے لٹک رہے ہیں۔ دروازہ کھول کر اندر گھُسا تو دروازے میں ایک گھنٹی لٹکی ہوئی تھی۔ خود بخود بجنے لگی۔ دکاندار کو اطلاع ہو گئی کہ گاہک آیا ہے۔ سامنے میز پر دو کاریگر کھڑے بجلی کی مشین پر کام کر رہے ہیں۔ سوٹ پہنے۔ گلے میں سفید گرد پوش باندھے کہ سُوٹ خراب نہ ہو جائے۔ ایک کونے میں ریڈیو سٹ بج رہا ہے۔ موسیقی کی تان پر کاریگر کا ہاتھ جلدی چلتا ہے۔ دوسرے دھیان بٹا رہے تو تھکتا نہیں۔ اس لئے باجہ بجتا رہتا ہے۔ دکاندار نے آگے بڑھ کر مسکرا کر سلام کیا۔ میں نے جوتہ پیش کیا۔ دُکاندار نے نہایت غور سے دیکھا۔ اور کہا آپ نے باہر دروازے پر نوٹس دیکھ لیا ہوگا اگست کے پہلے ہفتے میں ہماری دوکان کے کاریگر گرمی کی چھٹیاں منانے

چار سنتے ہیں، آپ کا کام پندرہ اگست کو تیار ملے گا۔ اور تلا لگوانے کے گیارہ شلنگ ہوں گے۔ (یعنی تقریباً سات روپے) میں نے کہا بہت اچھا۔ بنا دیجئے۔ دکاندار نے رجسٹر نکالا۔ میرا نام اور پتہ لکھا کاٹ کر رسید میرے حوالے کی۔

چمار کی دُکان سے نکلا تو دل میں معاً ہندُستان کا خیال آیا۔ کتنا فرق ہے یہاں کی زندگی میں۔ چاندنی چوک کا بڑے سے بڑا دکاندار بھی گرمی کی چھٹیاں نہیں مناتا۔ اسے ریڈیو کے گانے کب نصیب ہوتے ہیں۔ یہ رجسٹر پر گاہکوں کے نام کب لکھتا ہے اور پھر ہندُستان میں وقت پر کام کب تیار ملتا ہے، دل نے جواب دیا۔ حضرت ہندُستان کا چمار تلا لگانے کے سات روپے بھی تو وصول نہیں کرتا۔ سات روپے میں ہندُستان کا چمار اور نئے جوتے بنا دیتا ہے۔

چھ بجے شہر کی سب دکانیں بند ہو جائیں گی۔ جو کچھ خریدنا ہے جلدی جلدی خرید لیجئے۔ اتوار کو تو سب دکانیں بند رہتی ہی ہیں اس کے علاوہ بدھ کے دن ایک بجے سے بازار بند ہو جاتا ہے۔ گویا دُکاندار اور کاریگر کو ہفتے میں ڈیڑھ دن کی چھٹی ملتی ہے، یہ قانون دُکانداروں نے مل کر خود بنایا ہے۔ اسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔

بازار بند ہوتے ہی گاہکوں کی گرم بازاری ختم ہوئی۔ اندھیرا ہوتے ہی

گاؤں کے لڑکے بالے اور لڑکیاں سیر کرنے نکل آئے۔کچھ بازار کے اس کونے پر کھڑے ہنس بول رہے ہیں۔کچھ گرجا کے سامنے گا رہے ہیں۔ دور سے کچھ سپاہی گاتے چلے آرہے ہیں۔ان کے گانے بھی موسم کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔پچھلے سال جب لندن پر بم برس رہے تھے تو لندن کی تعریف کے گیت گائے جا رہے تھے۔ہر شخص کی زبان پر تھا"لندن پھر زندہ ہوگا"۔ہوائی جہازوں میں اڑ کر دشمن سے لڑنے والے سپاہیوں کی زندگی کا کیا بھروسہ۔ہر وقت ہتھیلی پر جان لئے پھرتے ہیں۔ان کا گیت تھا"میری محبوبہ میری سلامتی کے لئے دعا مانگو"۔سمندری بیڑے میں کام کرنے والے ملاح ہری جگ ہیں۔ان کی زندگی سمندر کی لہروں کی طرح رواں دواں رہتی ہے لیکن ہر جگہ یہ بھی گیت گاتے ہوئے نکل جاتے ہیں"گھبراؤ مت میں پھر آؤں گا"

دسمبر کے مہینے میں ایک شام غضب کی برف پڑ رہی تھی۔سردی کے زمانے میں چار بجے سے سورج چھپ جاتا ہے۔چاروں طرف اندھیرا تھا۔ سڑک پر سامنے مکانوں کی چھتوں پر ہر جگہ سفید برف جمی ہوئی تھی۔دو سپاہی ایک عجیب گیت گاتے ہوئے سڑک پر جا رہے تھے۔معلوم ہوا کہ یہ پچھلی لڑائی کا گیت ہے۔

"میں بمبئی سے آرہا ہوں۔میری پیاری میرا انتظار کر"میں ریڈیو

ہندُستان کا پروگرام سُن رہا تھا۔ ہندستان میں رات کے دس بج رہے ہیں۔ سمندر پار کے ہندُستانی سپاہیوں کے لئے ایک خاص پروگرام شروع ہو رہا ہے۔ اناؤنسر نے ایک ریکارڈ لگا دیا۔

"ڈولے، ڈولے ہردے کی نیّا"

میرے کمرے میں آگ جل رہی ہے۔ میں آتشدان کے سامنے ایرانی عبا پہنے بیٹھا ہوں۔ کتاب میرے ہاتھ میں ہے۔ لیکن دل ہندُستان پہنچ گیا۔ دلّی۔ جامع مسجد۔ جمنا۔ چاندنی چوک۔ لال قلعہ۔ خواجہ حافظ نے کیا آج ہی کے لئے کہا تھا۔ میں نے ریڈیو کی لہروں سے مخاطب ہو کر کہا:۔

اے صبا گر بگذری بر ساحلِ رودِ ارس
بوسہ زن بر خاکِ آں وادی و مشکیں کن نفس

لندن سے دلّی کی خدمت میں آداب عرض۔

دسمبر ۱۹۴۱ء

لندن کی ایک کھڑکی

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر میرے مکان میں یہ کھڑکی نہ ہوتی تو لندن کی زندگی کسقدر بدمزہ رہتی۔ بہار کے موسم میں ہر روز صبح اٹھ کر میں ننگے بُچّے درختوں پر سبز سبز شگوفے بڑھتے دیکھ کر دل کو اطمینان دیتا ہوں کہ اب سردی کا زمانہ ختم ہوا۔ گرمی کے خوشگوار موسم میں سامنے باغ کی سبز سبز گھاس اور پھولوں کی کیاریاں مجھے بتاتی ہیں کہ انگلستان والے گرمی پر کیوں جان دیتے ہیں۔ اکتوبر کے مہینے میں جب درختوں کے پتّے آہستہ آہستہ زرد ہونے لگتے ہیں تو میرا دل خوف سے کانپ اُٹھتا ہے۔ کہ اب انگلستان پر سردی کی یورش ہونے والی ہے۔ پتّے زرد ہوئے۔ اور زرد ہونے کے بعد ایک ایک کر کے گرنے لگے۔ اکتوبر کی ایک صبح کو جب میں نے اُٹھ کر کھڑکی کا پردہ اٹھایا تو درختوں کے نیچے بے شمار زرد پتّوں کا ڈھیر تھا۔ اور موسم خزاں کی تیز ہوا ان بے جان زرد پتوں کو بگولہ بنا کر اُڑا رہی تھی۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ سردی کے

موسم نے لندن پر ڈیرے ڈال دیئے۔ مگر ابھی تک میری کھڑکی کے سامنے ایک تناور درخت پتوں سے لدا کھڑا ہے۔ جب تک اس درخت کی ٹہنیوں پر پتے موجود ہیں۔ لندن پر سردی کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا ہر روز صبح اُٹھ کر میں اس تناور درخت کو دیکھ لیتا ہوں۔ درخت کے نیچے ہر روز سینکڑوں زرد پتوں کا ڈھیر لگ جاتا ہے۔ مگر ابھی تک اس درخت پر کچھ پتے باقی ہیں۔ دسمبر کی ایک صبح کو اُٹھ کر جب میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ لندن پر سردی کے موسم کی پہلی کُہر حملہ کر چکی تھی۔ کمرے کے اندر کُہر کے دل بادل گھر گئے دس قدم سامنے کی بھی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ اب میں سمجھ گیا کہ لندن کا روائتی جاڑا شروع ہو گیا۔ اور میرا دوست تناور درخت اس جاڑے کی قید میں گرفتار ہے۔ شام کو جب میں دفتر سے واپس آیا تو کُہر کٹ چکی تھی۔ اور آسمان پر تھوڑی سی روشنی باقی تھی۔ اس روشنی میں میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے درخت کو دیکھا۔ اس کی تمام شاخیں ننگی کھڑی تھیں۔ اور درخت پر کوئی پتہ باقی نہیں تھا۔

میرا مکان اس عمارت کی تیسری منزل پر ہے۔ اور یہاں سے مجھے دور دور کی عمارتیں نظر آتی ہیں۔ لندن کے ہائی کورٹ کی برجیاں بگ بن کے گھنٹہ گھر کا کلس۔ سینٹ پال کے گرجا گھر کا گنبد۔ اور آس

پاس کی بڑی بڑی عمارتوں کی محرابیں۔ دریائے ٹیمز میرے مکان سے بہت قریب ہے۔ دریا میری کھڑکی میں سے دکھائی تو نہیں دیتا لیکن جب دریا میں کوئی اسٹیمر یا جہاز چلتا ہے تو اس کی سیٹی صاف سنائی دیتی ہے۔ رات کو سوتے سوتے جب کسی جہاز کی آواز میرے کان میں آتی ہے۔ تو اکثر مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ میں خود جہاز میں سفر کر رہا ہوں۔

ہر روز صبح کے وقت میں اپنی محبوب کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر حجامت کرتا ہوں۔ اور بار بار نیچے آنے جانے والوں کو دیکھتا جاتا ہوں۔ ایک عرصے تک لوگوں کو دیکھتے دیکھتے اب میں انہیں پہچاننے لگا ہوں لیکن کسی سے میری واقفیت نہیں۔ نہ ان آنے جانے والوں کو خبر ہے کہ کوئی ہر روز صبح ٹھیک آٹھ بجے انہیں اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر دیکھتا ہے۔ پورے آٹھ بجے ایک چھوٹی سی موٹر آن کر میرے مکان کے نیچے ٹھہرتی ہے۔ غالباً یہ کسی بیرسٹر کی موٹر ہے۔ کیونکہ یہاں آس پاس بیرسٹروں کے ہی دفتر ہیں۔ موٹر کی آواز سنتے ہی ایک کالی بلی کہیں سے نکل موٹر کے گرد ایک چکر لگاتی ہے۔ مگر موٹر کے قریب نہیں جاتی۔ مجھے شروع شروع میں اس پر ذرا تعجب ہوا۔ مگر بعد میں بھید کھلا کہ اس کے فوراً بعد ہی ایک بہت شاندار بڑی سی سیاہ چمکدار موٹر آتی ہے۔ اور یہ بلی مزے سے اس موٹر کی چھت پر جا کر بیٹھ جاتی ہے

گویا پہلی موٹر اسقدر حقیر ہے کہ بلی اس کے قریب تک جانا کسر شان سمجھتی ہے۔ البتہ دوسری موٹر اس کے مرتبے کے مطابق ہے اسلئے اس پر جا کر اڈا جما لیتی ہے۔

ہر روز اسی وقت ایک دودھ والا ہاتھ کی گاڑی دھکیلتا ہوا آتا ہے۔ اس کی گاڑی میں بہت سی دودھ کی بوتلیں بھری رہتی ہیں۔ یہ دودھ کی ایک ایک بوتل گھروں کے سامنے رکھتا چلا جاتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی اسے میں نے کوٹ پہنے نہیں دیکھا۔ اس کی پتلون کی جیب میں صبح کا اخبار دبا رہتا ہے۔ خدا جانے یہ اخبار کب پڑھتا ہے۔ مگر آجتک میں نے اسے بغیر اخبار کے کبھی نہیں دیکھا۔

اس کھڑکی میں سے لوگوں کو دیکھ کر ان کا پیشہ بتانا میرا سب سے دلچسپ مشغلہ ہے۔ جھکے ہوئے شانے۔ سیاہ سوٹ۔ سفید کالر۔ کالی ہیٹ۔ ہاتھ میں چھتری۔ ناک کی پھننگ پر عینک۔ یقیناً کسی بیرسٹر کا منشی ہوگا۔ یا کسی دفتر کا کلرک۔ مردوں کے لباس سے ان کا پیشہ بہت آسانی سے بتایا جا سکتا ہے۔ مگر عورتوں کا لباس ہمیشہ دھوکا دیتا ہے۔ البتہ جو لڑکیاں تیز تیز قدم اٹھا کر چلتی ہیں۔ جیسے کہیں بھاگی جا رہی ہیں۔ یہ ضرور کسی بنک میں ملازم ہیں۔ کیونکہ بنک میں اوقات کی پابندی بہت سختی سے ہوتی ہے۔ وہ لڑکیاں جو آہستہ آہستہ ہنستی بولتی اس راستے

سے گذرتی ہیں۔ یہ دوکان پر ملازم ہیں۔ کچھ عورتیں ٹوپیاں پہنے دستانے چڑھائے خراماں خراماں عمارتوں کو دیکھتی جارہی ہیں۔ یقیناً یہ کہیں باہر سے لندن کی سیر کرنے آئی ہیں۔

اب تک مجھے سب سے بڑا دھوکا ایک ایسے شخص کے لباس نے دیا کہ جو بالکل میرے کمرے کے نیچے اسی عمارت میں رہتا ہے نو بجے کے قریب جب میں دفتر جاتا ہوں۔ تو ہر روز ایک ادھیڑ عمر کے شخص کو۔ کمر پر بڑا سا تھیلہ لادے۔ ہاتھ میں چھڑی لئے ننگے سر آتا دیکھتا ہوں اس شخص کا لباس عجب بے تکلف سا ہے۔ ٹائی کی جگہ ایک سبز رنگ کی چھوٹی سی دھجی گلے میں بندھی ہوئی۔ جوتے پر کئی کئی انگل گرد پتلون ایسی جیسے کئی برس سے اسپر استری نہیں ہوئی۔ کوٹ میلا چیکٹ، میں سمجھتا تھا یہ شخص کسی بیرسٹر کے ہاں ملازم ہے۔ یہی چائے وغیرہ بنا کر پلا دیتا ہوگا۔ مہینوں میں اس عجیب انسان کو دیکھتا رہا۔ اور دل میں کہتا رہا۔ کتنا غریب ہے۔ اس کے پاس نئے کوٹ کے لئے دام نہیں ہوں گے۔ میرے پاس ایک پرانا کوٹ رکھا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ یہ اسے دے دوں۔ ورنہ اسی سال سردی میں اسے ضرور نمونیہ ہو جائیگا

ایک روز میرے ایک انگریز دوست نے مجھ سے کہا کہ تمہارے گھر کے نیچے لندن کے سب سے مشہور بیرسٹر رہتے ہیں۔ یہ میرے

دوست ہیں۔ تم ان سے جا کر ضرور ملنا۔ میں نے تمہارا غائبانہ تعارف ان سے کرادیا ہے۔ چنانچہ اس روز شام کو میں نے بیرسٹر صاحب کے دفتر کی گھنٹی بجائی۔ اندر سے آواز آئی، آجائیے۔ اب جو میں کمرے میں گھسا تو ایک بہت بڑی میز پر کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ اور اس میز کے سامنے وہی غریب آدمی پھٹے ہوئے کوٹ میں سکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ حیرت سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ واقعی یہ غریب شخص لندن کا سب سے بڑا بیرسٹر تھا۔ جو خود کبھی عدالت میں نہیں جاتا۔ بلکہ بڑے بڑے بیرسٹر اس سے آن کر اپنے مقدموں کے لئے مشورہ کرتے ہیں۔ پچھلے سال یہ بیرسٹر ایک مقدمہ میں مشورہ دینے کے لئے امریکہ گیا تھا۔ امریکہ میں اس کی ایک دن کی فیس ڈیڑھ ہزار روپیہ تھی۔ اور آنے جانے کا خرچ اس سے الگ رہا۔

اب ان بیرسٹر صاحب سے میری خوب دوستی ہو گئی۔ انہیں بھی میری طرح پیدل چلنے کا بہت شوق ہے۔ ان کا گھر لندن سے کوئی آٹھ میل باہر ہے۔ اور صبح شام یہ پیدل دفتر آتے ہیں۔ اور پیدل دفتر سے گھر جاتے ہیں۔ بیرسٹر صاحب نے یہ فقرہ خوب کہا۔ کہ انسان جب پیدل چلتا ہے تو تمام دنیا اس کے لئے ایک تماشہ بن جاتی ہے۔ اور ہمارا اس تماشے سے کبھی جی نہیں اکتاتا۔ چنانچہ آج ۴۵ سال سے یہ بلاناغہ

پیدل آتے جاتے ہیں۔ اور ان کی صحت خراب نہیں ہوئی۔

ہمارے علاقے میں دس بجے کے قریب ایک بڈھا آن کر چھوٹی سی دکان لگا لیتا ہے۔ یہی سگرٹ۔ سیب، ناشپاتیاں۔ ٹماٹر اور دیا سلائیاں بیچتا ہے۔ اس کے اکثر گاہک بیرسٹر اور بیرسٹروں کے کلرک ہیں۔ اس کا دعوٰی ہے کہ لندن ہائی کورٹ کے بڑے بڑے جج بھی مجھ سے سگرٹ خریدنے آتے ہیں۔ اور چند منٹ اس کی دکان پر ٹِک کر باتیں کرتے ہیں۔ اور یہ واقعہ بھی ہے کہ بیرسٹروں اور ججوں کے ہاتھ سودا بیچتے بیچتے اس بڈھے کی شکل بھی اب فاضل ججوں کی سی ہوگئی۔ وہی چہرے پر شاندار متانت، ماتھے پر اوپر تلے کئی درجن شکن۔ بھنچے ہوئے لب۔ اور لبوں پر کبھی کبھی پُروقار مُسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک۔ اتوار کے دن یہ بڈھا چھٹی مناتا ہے۔ مگر پاس ہی ایک گرجا گھر ہے۔ اس کے دروازے پر کھڑے ہو کر لوگوں کو مذہب کی تبلیغ کرتا ہے۔ میری اس سے اکثر بہت دلچسپ باتیں ہوتی ہیں۔ ایک دن یہ اپنے لڑکے کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے کہا تمہارا لڑکا فوج میں ہے، بڈھے نے مُسکرا کر کہا۔ فوج ؟ میرا لڑکا انگلستان کے شاہی بیڑے میں ایک جنگی جہاز کا کپتان ہے۔ یہ جُملہ جس غرور سے اس بڈھے نے کہا۔ اس کا اثر اب تک میرے دل پر قایم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ کا سارا شاہی بیڑا اسوقت بڈھے کی دُکان کے سامنے کھڑا اسلامی اتار رہا ہے

اسی بازار میں بہت سی دکانیں بھی ہیں۔ ایک دکان پر لکھا ہے کہ یہاں صرف مردوں کے بال کاٹے جاتے ہیں۔ اور بال کاٹنے والی ایک عورت ہے۔ اس عجیب و غریب اعلان پر مجھے تعجب ہوا۔ کیونکہ انگلستان میں مردوں کے بال کسی عورت کو کاٹتے میں نے نہیں سنا تھا۔ ایک دن میں اس دکان میں چلا گیا۔ ہوگی کوئی ۶۰، ۶۵ برس کی ایک بڑھیا۔ معلوم ہوا کہ یہ عورت ۴۰ برس سے اسی دکان میں کام کر رہی ہے۔ اس کی دکان پر جرمنوں کا بم گرا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ جھاڑ پونچھ کر پھر کام شروع کر دیا۔

حجام چاہے انگلستان کا ہو یا ہندستان کا۔ اسے باتیں کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ میں نے طہران۔ شیراز۔ اصفہان۔ بغداد۔ بصرہ اور کیپ ٹاؤن سب جگہ جا کر حجاموں سے بال کٹوائے ہیں۔ اور ہر جگہ مجھے یہی معلوم ہوا کہ انہیں ایک ہی اُستاد نے سبق پڑھایا ہے۔ چنانچہ لندن کی اس حجام عورت سے بھی بہت دیر تک باتیں ہوئیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس ہفتے لندن کے ریڈیو ٹائمز اخبار میں میری تصویر چھپی تھی۔ یہ عورت فوراً مجھے پہچان گئی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اُس زمانے میں اس تصویر کی وجہ سے میں خاصہ چھپا چھپا پھرتا تھا۔ بنئے بقّال کے ہاں سودا لینے گیا۔ اس نے تصویر کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس حجام عورت سے بھی باتوں باتوں میں ہندُستان اور دنیا جہان کا ذکر

آگیا۔ معلوم ہوا کہ بہت پڑھی لکھی عورت ہے۔ اشتراکیت پر کوئی کتاب ایسی نہیں جو اس نے نہ پڑھی ہو۔ اور اس کی معلومات تو بے حد وسیع ہیں کہنے لگی میری ایک بہن اپنے انگریز خاوند کے ساتھ ہندستان میں رہتی ہے۔ لیکن خدا جانے اب اُسے کیا ہو گیا۔ ایک دفعہ جب یہ ہندستان سے آئی تو اس کا دماغ آسمان پر تھا۔ اس کی سمجھ میں ہماری کوئی بات ہی نہیں آتی تھی۔ میں نے کہا شاید مشرق کی آب و ہوا مغرب والوں کو راس نہیں آتی۔

دسمبر کی ایک صبح کو جب میں اُٹھا تو کھڑکی میں سے مجھے چاروں طرف سفید برف کی چادر نظر آئی۔ لیجئے لندن پر برف نے دھاوا بول دیا۔ نیچے سڑک پر سب راہ گیر برف پر پاؤں جما جما کر چل رہے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں جب کچھ نظر نہیں آتا تو میں کھڑکی میں سے کھڑا اس سفید برف کی چادر کو دیکھتا رہتا ہوں۔ آسمان پر بجلی کی روشنی دشمن کے جہازوں کے لئے کروٹیں بدل رہی ہے۔ کبھی کبھی کوئی ہوائی جہاز غراتا ہوا لندن پر سے گذر جاتا ہے۔ لیکن یہ دشمن کا نہیں، بلکہ اتحادیوں کا ہوائی جہاز ہے۔ دریائے ٹیمز میں سے اسٹیمر گذر رہے ہیں۔ بگ بن کا گھنٹہ ہر پندرہ منٹ کے بعد بج رہا ہے میں آگ کے سامنے بیٹھا ہوں۔ کھڑکی پر سیاہ رنگ کا پردہ پڑا ہے

کہ روشنی کی شعاع باہر نہ نکل جائے۔ سڑک پر سے ہوائی حملے کے چوکیدار نے کسی کھڑکی میں سے روشنی کی رمق نکلتی دیکھ لی۔ اِس لئے نیچے سے چلّا کر کہہ رہا ہے "خبردار۔ روشنی نظر آ رہی ہے۔ کھڑکی کا پردہ سرکا لیجئے"

میں اپنے دل میں سوچتا ہوں کہ اگر میرے مکان میں یہ کھڑکی نہ ہوتی تو لندن کی زندگی کسقدر بے لطف رہتی۔

۱۰ر دسمبر ۴۲ء

ہنوز دلّی دُور

صبح کے سات بجے والی ٹرین سے مجھے اکثر لندن جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ سردی کے موسم میں کہیں نو دس بجے سورج نکلتا ہے۔ ان دنوں صبح کے چھ بجے اُٹھ کر لندن جانے کی تیاری کا مطلب یہ ہے۔ کہ آدھی رات ہی کو بستر سے نکل آئے چاروں طرف اندھیرا۔ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا کھڑکی میں سے جھانک کر باہر دیکھا تو میدان اور سڑک پر سفید برف کی چادر پھیلی ہوئی ہے۔ رات بھر برف روئی کے گالوں کی طرح پڑتی رہی۔ اندھیرے میں دودھیا رنگ کی برف کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ہندستان میں رات کی خاموشی میں اگر کان لگا کر سُنیئے تو سینکڑوں قسم کی آوازیں سُننے میں آتی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو جھینگر ہی بول رہے ہیں۔ ڈیرہ دون میں بہار کا موسم آتے ہی آموں کے درختوں پر کویل کو کنے لگتی تھی۔ سردی کے دنوں میں ہمارے بنگلے کے پیچھے رات بھر گیدڑ چلایا کرتے تھے۔ اور جنگل میں تو آوازوں کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں۔ اکثر میں اپنے شاگردوں کے ساتھ ڈیرہ دون کے

جنگلات میں جا کر ٹھہرا ہوں۔ ایک دفعہ ہم سب نے مل کر رات کو
اندازہ لگایا کہ کچھ نہیں تو بیس قسم کی مختلف آوازیں رات بھر آتی رہیں،
مگر انگلستان میں کچھ اور ہی عالم ہے۔ یہاں رات کو ایسی زبردست
خاموشی ہوتی ہے کہ باوجود کوشش کے کسی جاندار کی آواز سُننے میں نہیں
آتی۔ البتہ لڑائی کی وجہ سے آسمان پر ہوائی جہاز برابر اُڑتے رہتے
ہیں۔ اگر ہوائی جہازوں کی آواز کو چھوڑ دیا جائے تو پھر کسی قسم کی
آواز اِس خاموشی کو نہیں توڑ سکتی۔

ہندستان میں اور کچھ نہیں تو محلّے کے کتّے ہی رات بھر سُر میں سُر
ملا کر بے وقت کی راگنی گاتے رہتے ہیں۔ یہاں اوّل تو بازار کے
کتّے نہیں ہوتے۔ اور جن لوگوں نے اپنے گھروں میں کتّے پالے ہیں
وہ بھی کچھ ایسے سَدھ گئے ہیں کہ رات کو کبھی نہیں بھونکتے۔ حد یہ
ہے کہ ہمارے گھر میں دو بلّیاں پلی ہوئی ہیں۔ کبھی رات بے رات
مجھے خیال آتا ہے کہ کاش یہی دونوں بلّیاں آپس میں لڑیں جھگڑیں
اور اِن کی میاؤں میاؤں سے رات کی خاموشی ٹوٹ جائے۔ مگر ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ سردی نے اِن بیچاری بلّیوں کے جذبات بھی
سرد کر دیئے۔

برف گرنے سے پہلے ہی باغوں کے پرندے یہ ملک چھوڑ کر

کہیں اور نکل جاتے ہیں۔ اس لئے سردی بھر پرندوں کے دیکھنے کو بھی آنکھیں ترستی ہیں۔ البتہ مارچ کا مہینہ شروع ہوتے ہی صبح کے وقت چڑیوں اور چھوٹے چھوٹے پرندوں کی چوں چوں سے باغ میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ بہت شوق سے موسم بہار میں فاختہ کی آواز سننے کے منتظر رہتے ہیں۔ اور جو شخص سب سے پہلے فاختہ کو بولتے سنتا ہے۔ وہ اپنا تجربہ فوراً اخبار میں چھپوا دیتا ہے۔ چنانچہ لندن کے اخبار ٹائمز میں پرندوں کے متعلق اکثر خبریں اور خط چھپتے رہتے ہیں۔ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم چیمبر لین مرحوم کو صبح کے وقت لندن کے سینٹ جیمز پارک میں ٹہلنے کا بہت شوق تھا۔ اور اکثر انہوں نے اخبار ٹائمز کو خط کے ذریعے اطلاع دی ہے کہ آج میں نے اس موسم بہار میں سب سے پہلی دفعہ فاختہ کی آواز سنی تھی۔

ہاں تو میں صبح سات بجے والی ٹرین کا ذکر کر رہا تھا۔ سردی کے موسم میں اس گاڑی سے لندن جانا میرے لئے جہاد سے کم نہیں۔ جلدی جلدی چائے بنا کر پی۔ بدن میں ذرا سی گرمی پیدا ہو گئی۔ بڑے اور کوٹ میں اپنے آپ کو لپیٹا۔ گلے میں اونی مفلر ڈالا۔ ہاتھ میں موٹے موٹے دستانے پہنے۔ اور چھوٹا سا بکس اٹھا کر اسٹیشن کی طرف لپکا۔ سڑک

بالکل سُنسان پڑی ہے اندھیرے میں برف پر چلنا بھی آسان نہیں معلوم ہوتا ہے کہ مجھ سے پہلے کوئی اور اس راستے پر چلا ہے کیونکہ جگہ جگہ برف میں قدموں کے نشان ہیں۔ میں بھی انہی نشانوں پر پاؤں جماتا چلا جا رہا ہوں۔ سڑک پر کبھی کبھی کوئی موٹر یا فوجی لاری گذر جاتی ہے۔ فوجی لاری کی جسامت کا اندھیرے میں کچھ یونہی سا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیجئے اسٹیشن آگیا۔ دُور سے سگنل کی سبز روشنی نظر آ رہی ہے۔ اِسکا مطلب یہ ہے کہ سات بجے والی گاڑی آج وقت پر آ رہی ہے۔ سامنے شہر سے کچھ اور لوگ بھی جلدی جلدی اسٹیشن کی طرف چلے آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر لندن جانے والے ہیں۔ باقی آس پاس کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ اب پہلی گاڑی سے اپنے اپنے کام پر جا رہے ہیں۔

پلیٹ فارم پر ایک چھوٹے سے کمرے میں آتشدان کے سامنے بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ آتشدان میں کچھ یونہی سی آگ جل رہی ہے۔ اس کی حرارت مشکل سے ان لوگوں کو پہنچتی ہوگی۔ مگر پھر بھی آگ کے نام سے ہی سردی کے موسم میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس لئے جسے آگ کے سامنے جگہ نہیں ملی وہ ایسی جگہ کھڑا ہو گیا کہ جہاں سے انگاروں کا سُرخ رنگ نظر آ سکتا تھا۔ ویٹنگ روم میں بالکل خاموشی ہے

لوگ چپ چاپ ٹرین کا انتظار کر رہے ہیں کبھی کبھی کوئی مسافر چپکے سے کسی ساتھی سے کچھ کہہ دیتا ہے۔ ورنہ جو شور و شغب اسٹیشنوں پر ہونا چاہیئے اُسکا عشرِ عشیر بھی یہاں سننے میں نہیں آتا۔ اتنے میں اسٹیشن کے ایک ملازم نے بلند آواز سے کہا۔ آکسفورڈ۔ اور لندن جانے والی ٹرین۔ آکسفورڈ اور لندن جانے والی ٹرین۔ مسافر سمجھ گئے کہ اب دو چار منٹ میں گاڑی آنے والی ہے۔ سب نے اپنا اپنا سامان اُٹھا لیا لیکن ان کا سامان اسقدر کم ہے کہ کسی کو قلی کی ضرورت نہیں ہوئی دُور سے انجن کی آواز آئی اور گاڑی پلیٹ فارم پر آکر رک گئی۔

گاڑی کے ڈبوں میں بھاپ کے ذریعے حرارت اور گرمی کا انتظام ہے۔ جلدی سے دروازہ کھول کر اُترنے والے مسافر پہلے اُترے، جب تک مسافر اُترتے رہے۔ اندر جانے والے مسافروں نے انتظار کیا۔ جب یہ اُتر چکے تو دوسرے مسافر ڈبوں میں جاکر بیٹھ گئے دروازے بند کر لئے۔ کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں کہ دشمن کے ہوائی جہازوں کو روشنی کی رمق نظر نہ آجائے۔ اس قانون کو کوئی نہیں توڑتا۔ کیونکہ قانون توڑنے سے ہزاروں مسافروں کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔ اور اپنے ملک کی حفاظت کا سب کو خیال ہے۔ تین منٹ کے بعد بغیر سیٹی دیئے انجن چل پڑا۔ اور سب

مسافر اخبار یا کتاب دیکھنے لگے۔

ریل چاہے ہندستان کی ہو یا انگلستان کی، لیٹ ضرور ہوجاتی ہے۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ اگر ہندستان میں اسٹیشن سے پہلے کہیں راستے میں ریل ٹھہر جائے تو بہت سے مسافر شوقیہ ریل کے ڈبوں میں سے اُتر کر پٹری کے آس پاس ٹہلنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور جب انجن ڈرائیور دوبارہ ٹرین چلاتا ہے تو اسے بار بار سیٹی بجا کر مسافروں کو اطلاع دینی پڑتی ہے۔ مگر یہاں کچھ اور دستور ہے کہ اسٹیشن پر بھی مسافر بغیر کسی ضرورت کے نہیں اُترتے۔ اسکی ایک وجہ تو غالباً سردی ہے۔ کہ کیوں بند گرم ڈبے سے نکل ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے کھائے۔ دوسرے یہاں کے ڈبوں میں مقررہ تعداد سے زیادہ مسافر کبھی نہیں بیٹھتے۔ اس لئے انھیں پلیٹ فارم پر اُتر کر ذرا ہوا کھانے اور جی بہلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ریل کی پٹری پر برف پڑی ہوئی تھی۔ اس لئے آج ہماری ٹرین لیٹ ہوگئی۔ کوئی آدھے گھنٹے تک اسٹیشن سے دور کھڑی رہی اب بلیک آؤٹ کا وقت بھی گذر چکا تھا۔ اور باہر ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ اس لئے میں نے برابر والی کھڑکی کا پردہ سرکا لیا۔ باہر درخت۔ جھاڑیاں کھیت۔ راستے۔ پگڈنڈیاں سب برف سے

اَٹی پڑی تھیں۔ اور دُور دور تک سوائے برف کے کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔ میرے ہاتھ میں بھی ایک کتاب تھی لیکن پڑھتے پڑھتے میرا جی اُکتا گیا۔ اس لئے میں نے کہا کہ چلو اپنے ساتھی مسافروں کا جائزہ لو۔ یہ انگریزوں کی قومی خصوصیت ہے کہ اجنبی سے کبھی بات نہیں کرتے۔ چنانچہ ریل ہی میں کئی کئی گھنٹے متواتر سفر کیجیے۔ مگر کیا مجال جو کوئی مسافر کسی سے بات چیت کر لے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ اس قوم میں غرور کی علامت ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ عادت اب ان کی فطرت بن چکی ہے۔ اور اسے بدلتے بدلتے بہت دیر لگے گی، لڑائی کے بعد سے انگلستان میں تمام یورپ، امریکہ اور دوسرے علاقوں سے لوگ آکر آباد ہو گئے ہیں۔ اور جب یہ لوگ ریل میں سفر کرتے ہیں تو اکثر باتوں کی آواز آجاتی ہے۔ اس کے علاوہ لڑائی نے ایک حد تک انگریزوں کی فطرت پر بھی اثر کیا ہے۔ اور یہ بھی بات چیت کے عادی ہوتے جاتے ہیں۔ غالباً اسی لئے گورنمنٹ نے ہر ایک گاڑی میں اس مضمون کا اشتہار لگا دیا ہے۔ کہ مسافروں کو راز کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ کیونکہ اس سے دشمن کو ہمارے بھیدوں کا پتہ چل سکتا ہے۔ گویا "دیوار ہم گوش دارد" کے مقولے کو انگریزی زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

میری گاڑی میں آٹھ مسافروں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ مگر ابھی تک میرے علاوہ صرف دو اور مسافر بیٹھے ہیں۔ لباس سے یہ کسان یا کاشتکار معلوم ہوتے ہیں لیکن صبح کا اخبار ان کے ہاتھ میں ہے۔ اور بہت غور سے یہ تازہ خبریں پڑھ رہے ہیں۔ اتنے میں گاڑی پھر چلی اور ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر جا کر رُک گئی۔ یہ گاؤں آکسفورڈ کے نزدیک ہے۔ اور یہاں سے بہت سی لڑکیاں اور عورتیں کام کرنے کے لئے آکسفورڈ جا رہی ہیں۔ دن بھر یہ آکسفورڈ کے کارخانوں میں کام کریں گی اور شام کو اپنے گاؤں واپس آجائیں گی۔ ان میں زیادہ تر نوعمر لڑکیاں ہیں جو ابھی فوج میں بھرتی نہیں ہوئیں۔ ورنہ ۲۱ سال کے بعد ہر ایک عورت کو لازمی طور سے فوج میں بھرتی ہونا پڑتا ہے۔ ان میں سے کچھ کارخانوں میں کام کرتی ہیں۔ اور زیادہ تر آکسفورڈ کے چائے خانوں میں ملازم ہیں۔ لکھنا پڑھنا انھیں واجبی سا آتا ہے۔ اس لئے نہ ان کے پاس کوئی اخبار ہے نہ کتاب۔ یہاں سے آکسفورڈ تک کوئی آدھے گھنٹے کا راستہ ہے۔ آپس میں ہنس بول کر کاٹ دیں گی۔ چونکہ یہ ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ اس لئے گاڑی میں آتے ہی انہوں نے بات چیت شروع کر دی۔ عام طور پر اپنے لباس اور اپنے دوستوں کا ذکر کرتی ہیں۔ ایک لڑکی نے نیا لباس خود تیار کیا ہے۔ اس کا فخریہ

بیان کر رہی ہے۔ لڑائی کے زمانے میں لباس کی راشن بندی ہے اچھے کپڑے پہننے کو کس کا جی نہیں چاہتا۔ دوسری لڑکیاں بہت شوق سے اس کے لباس کی تفصیل سُن رہی ہیں۔ ایک اور لڑکی نے نئی جوتیاں خریدی ہیں۔ سب اس کے خوبصورت شوز کی تعریف کر رہی ہیں۔ ایک لڑکی کا منگیتر فوج میں ملازم ہے۔ ہر ہفتے اس کا خط آتا ہے۔ یہ خط پڑھ کر اوروں کو سُنا رہی ہے۔ ایک اور لڑکی نے کہا۔ میرا منگیتر ہوا باز ہے۔ اور اب بہت جلد سمندر پار جانے والا ہے

گاڑی ایک اور چھوٹے سے اسٹیشن پر ٹھہری۔ یہاں سے چند فوج کے سپاہی ٹرین میں سوار ہوئے۔ یہ اب چھٹی سے ملازمت پر واپس جا رہے ہیں۔ کندھے پر بندوق بغل میں سامان کا تھیلا۔ کسی کی بوڑھیا ماں اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے آئی ہے۔ ایک سپاہی کی بیوی گود میں چھوٹا سا بچہ لئے پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔ سپاہی بیوی سے باتیں کر رہا ہے۔ مگر بچے کو پلیٹ فارم پر ایک بڑے سے جہاز کی رنگین تصویر پسند آگئی۔ بچہ تصویر کی طرف تکے جاتا ہے۔ اسے خبر بھی نہیں کہ میرا باپ لڑائی پر جا رہا ہے۔ یہاں سے گاڑی چل کر سیدھی آکسفورڈ کے اسٹیشن پر ٹھہرے گی۔

آکسفورڈ پر یہ لڑکیاں اور کسان تو اُتر گئے۔ اب ان کی جگہ نئی

قسم کے مسافر گاڑی میں بیٹھے۔ یہ سب مسافر لندن جا رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے آکسفورڈ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں۔ لمبے لمبے بے ترتیب بال۔ گلے میں رنگ برنگ کے اونی بڑے بڑے مفلر۔ ہاتھ میں اخبار رسالے۔ کتابیں۔ کچھ اور لوگ سیاہ سوٹ پہنے۔ سفید کالر۔ سیاہ ٹائی لگائے۔ ہاتھوں میں سفید دستانے لئے ٹرین میں داخل ہوئے۔ یہ دفتروں کے کلرک ہیں یا چھوٹے موٹے سوداگر۔ جو کسی ضروری کام سے لندن جا رہے ہیں۔ بہت سی عورتیں بھی آکسفورڈ سے گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ لندن سلطنت کا پایۂ تخت ہے۔ لندن میں سب چیزیں عمدہ مل جاتی ہیں۔ اس لئے یہ سب خرید و فروخت کے لئے اکثر لندن آتے جاتے رہتے ہیں۔ ان لوگوں کے آنے سے گاڑی کی فضا بالکل بدل گئی۔ وہ پہلے جیسی بے تکلفی نہیں رہی۔ سب نے اخبار دیکھنے شروع کئے یا کتابوں پر سر جھکا لیا۔

میں نے آکسفورڈ کے ریلوے اسٹیشن پر ایک نظر ڈالی۔ ریل کے ملازم انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ ایک ہی اُستاد کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ اسٹیشن ماسٹر کا وہی بڑا سا پیٹ۔ گھڑی کی چین واسکٹ میں لٹکتی ہوئی۔ پلیٹ فارم پر مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ ٹہل رہے ہیں۔ گارڈ کی بغل میں وہی سرخ اور سبز دو کپڑے کی جھنڈیاں لمبے لمبے ڈگ

بھرتا ہوا ایک سرے سے دوسرے سرے تک پلیٹ فارم پر بھاگا چلا جاتا ہے۔ البتہ ایک نئی بات یہ دیکھی کہ قلی مرد نہیں بلکہ عورتیں ہیں لڑائی کی وجہ سے مرد فوج میں بھرتی ہو گئے۔ اس لیئے ان کی جگہ عورتیں کام کر رہی ہیں۔ اور یہ عورتیں بالکل مردوں کی طرح بڑے بڑے پارسل اور بکس اٹھا کر ریل میں رکھ دیتی ہیں۔ ایک اسٹیشن پر میں نے عجیب تماشہ دیکھا۔ گاڑی چلنے والی تھی۔ ایک بھاری بھرکم مسافر ٹرین میں بیٹھنا چاہتا تھا۔ مگر دروازہ نہیں کھلتا تھا۔ بے چارہ مسافر دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر ہینڈل گھمانا چاہتا تھا۔ مگر ہینڈل کو بھی ضد سی ہو گئی تھی اتنے میں ایک لڑکی ریلوے قلی کی نیلی وردی پہنے، پتلون ڈاٹے آئی اور ایک ہاتھ سے ہینڈل کو گھما کر کھول دیا۔ سب مسافر اندر بیٹھے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اُسوقت اُس غریب مسافر کی بے کسی اور لاچاری دیکھنے کے قابل تھی۔

یہاں کی ریلوں کا ٹکٹ چیکر بھی ایک عجیب دلچسپ چیز ہے۔ یہ مسافروں سے نہایت اخلاق اور ادب سے ٹکٹ مانگتا ہے۔ ٹکٹ دیکھ کر ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ٹکٹ چیکر اپنے آپ کو مسافروں کا خادم سمجھتا ہے، اسے ریلوے نے لوگوں کی خدمت کے لیئے مقرر کیا ہے۔ اس لیئے اس کی آنکھوں سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ

ٹکٹ چیکر مسافروں کو جیل خانے بھجوانے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ جس مسافر کو ٹکٹ لینے کی مہلت نہیں ملی تھی اُس سے روپے لے کر رسید دے دیتا ہے اسپر دوسرے مسافر اس بیچارے مسافر کو شبہے کی نظروں سے بھی نہیں دیکھتے۔

آکسفورڈ سے چل کر یہ ٹرین سیدھی لندن کے اسٹیشن پر ٹھہرے گی، میں نے ہمراہیوں کا ایک مرتبہ پھر جائزہ لیا۔ سب مسافر اخبار دیکھ رہے ہیں۔ مگر ایک عورت بیٹھی کچھ بُن رہی ہے۔ اور ایک دوسری عورت اُسے غور سے دیکھ رہی ہے۔ پہلی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ یہ دوسری عورت انگریز نہیں بلکہ غیر ملکی ہے۔ غالباً جنوبی امریکہ یا اسپین کی رہنے والی ہو گی۔ کیونکہ اس کی سج دھج اور لباس میں بہت فرق ہے۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر سُرخی کی پپڑی اس بُری طرح جمی ہوئی ہے کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ خدا جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا کہ یہ موٹے ہونٹوں والی عورت ضرور اس خاموشی کو توڑے گی۔ چنانچہ گاڑی چلتے ہی اُس نے دوسری عورت سے سوال کیا۔ یہ تم کیا بُن رہی ہو۔ اس کے سوال پر سب مسافروں نے بھویں سکیڑ لیں۔ انگریز عورت نے اسکا مناسب جواب دے دیا۔ تھوڑی دیر بعد یہ پھر بولی کہ میں بھی اپنے خاوند کے لئے ایک سوئٹر بُن رہی ہوں۔ اور بغیر کسی مزید سوال کے اس نے اپنے خاوند کی

سرگذشت سنانی شروع کر دی۔ وہ فوج میں ملازم ہے۔ بہت جلد لفٹننٹ ہونے والا ہے۔ ہم دونوں جہاں جاتے ہیں بہت عمدہ اور مہنگے ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ انگریز عورت اخلاقاً ہوں ہاں کرتی رہی۔

اب لندن کے گرد و نواح کا علاقہ شروع ہو گیا۔ پاس پاس مکان نظر آنے لگے۔ جوں جوں لندن قریب آتا جاتا ہے دھواں اور غبار بڑھتا جاتا ہے۔ عمارتیں بلند ہو رہی ہیں۔ اب ہماری گاڑی لندن کے ایک غریب علاقے میں سے گذر رہی ہے۔ غریب آبادی کے مکانوں کی فلاکت زدہ حالت کا ایک نظر میں اندازہ ہو جاتا ہے۔ پیر کے دن ہفتے بھر کے میلے کپڑے دھوئے جا رہے ہیں۔ الگنی پر دھو دھو کر کپڑے عورتوں نے لٹکا دیئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ٹرین دھوبی گھاٹ کے پاس سے گذر رہی ہے۔

تھوڑی دیر میں اسٹیشن لندن کے بہت بڑے پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی، ہزاروں آدمی ٹرین سے اتر پڑے۔ جلدی جلدی لوگوں نے سامان اٹھایا ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ موٹے ہونٹوں والی عورت اب بھی اپنے خاوند کا ذکر کر رہی تھی "میں بغیر ٹیکسی کے ایک قدم نہیں چلتی میرا خاوند میرا سامان اٹھا کر چلتا ہے"۔

میں لندن کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔ لندن کا ہجوم سمندر

کی لہریں سمجھئے۔ کہ ان لہروں میں ملنے کے بعد کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔ میں نے اپنے جی میں کہا۔ اگرچہ میں لندن پہنچ گیا۔ مگر ابھی بہت سا سفر باقی ہے۔ اور دلّی تو ابھی بہت دور ہے۔

نومبر ۱۹۴۱ء

لندن سے روانگی

گاڑی رات کے ساڑھے گیارہ بجے جاتی تھی۔ مگر ہم سب نے فیصلہ کیا کہ آجکل لندن میں موٹر ٹیکسی بہت مشکل سے ملتی ہے۔ اسلئے شام ہی سے روانہ ہونے کی تیاری کرلینی چاہئے۔ چنانچہ ٹیکسی لانے کے لئے خلیفہ کو آٹھ بجے کے قریب گھر سے چلتا کیا۔ خلیفہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک کام جو ان کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کی سب تفصیلات سمجھنے کے بعد اسے یہ کر ڈالتے ہیں۔ جب انہیں پوری طرح سے سبق پڑھا دیا گیا کہ فلیٹ اسٹریٹ سے نکل کر اسٹرینڈ تک کہیں نہ کہیں ٹیکسی مل جائے گی۔ تو ہم سب کو اطمینان ہو گیا کہ اب خلیفہ بغیر ٹیکسی کے نہیں آسکتے۔

اس عرصے میں ہم نے ایک ایک کرکے سامان کے سب عدد تیسری منزل سے اتار دروازے کے سامنے لگا دئیے۔ بڑے بڑے سوٹ کیس جن پر سنسر کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ کاغذوں کے ہینڈ بیگ،

کمبل میں لپٹا ہوا ایک پارسل جس میں تین چھریاں اس طرح پروئی ہوئی تھیں کہ اس پارسل کو اٹھانا اپنی ٹانگوں کو زخمی کرنا تھا۔ جب یہ سب سامان دروازے کے سامنے قرینے سے لگ گیا تو ہم تینوں دوست نہایت اطمینان سے اس کے سامنے ٹہلنے لگے۔ مگر خلیفہ یا ٹیکسی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ سامنے والے گرجا نے رات کے نو بجائے۔ ہائی کورٹ کے گھڑیال نے ساڑھے نو کا اعلان کیا۔ دس بجے کا گھنٹہ بجا۔ مگر ٹیکسی ندارد۔ آخر مجبور ہو کر مقبول صاحب ٹیکسی لینے چلے۔ آدھے گھنٹے بعد خلیفہ ہاتھ ہلاتے ہوئے پریشان صورت واپس آ گئے۔ کہ فلیٹ اسٹریٹ۔ اسٹرینڈ۔ پکے ڈلی۔ ریجنٹ اسٹریٹ۔ اور آکسفورڈ سرکس سے لیکر ٹوٹن ہام کورٹ تک کہیں ٹیکسی نہیں ملتی۔ یہ نہیں کہ ٹیکسیاں نہیں ہیں۔ مگر سب رکی ہوئی۔ میں نے دل میں کہا، کہیں اس کمبخت ٹیکسی کی وجہ سے جہاز نہ چھوٹ جائے۔ کیونکہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے والی آخری ٹرین تھی کہ جس کے ذریعے میں بندرگاہ تک وقت پر پہنچ سکتا تھا۔ خلیفہ سے میں نے نہایت عاجزی سے کہا کہ میاں ذرا زمین دوز ٹرین میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن تک چلے جاؤ۔ شاید وہاں کوئی مسافر ٹیکسی میں آئے اور یہ ٹیکسی تمہارے ہاتھ لگ جائے خلیفہ نے جب یہ بات پوری طرح سے سمجھ لی تو ٹیوب اسٹیشن کی طرف

چل دیئے۔ مگر ابھی یہ مشکل سے دو سو گز گئے ہوں گے کہ مقبول صاحب ٹیکسی لے کر آ گئے میں نے مقبول صاحب کو خلیفہ کے پیچھے دوڑایا کہ لینا میاں خلیفہ کو وہ ٹیکسی لینے جا رہے ہیں۔ انہیں روکنا۔ ورنہ ناحق پریشان ہوں گے۔ گویا مقبول صاحب کا پہلا فرض یہ تھا کہ ٹیکسی لینے کے لئے دوڑیں اور جب ٹیکسی لے آئیں تو خلیفہ کے پیچھے بھاگیں۔ اور انہیں ٹیکسی لانے سے روکیں مقبول صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وقت بیوقت بہت کام آتے ہیں۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا ہے کہ ہم سب کسی کام سے بے آس ہو کر بیٹھ گئے اور سب کو یقین ہو گیا کہ اب یہ کام کسی طرح انجام نہیں پا سکتا مگر عین اُس وقت مقبول صاحب نے مُسکرا کر اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکالی اور اس کے چند ورق اِدھر اُدھر پلیٹ کر ٹیلیفون کا نمبر نکال لیا اس کے بعد مقبول صاحب کی کامیابی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے

غرض مقبول صاحب خلیفہ کو روکنے کے لئے بھاگے اور اِدھر ہم دونوں نے مل کر سامان ٹیکسی میں لدوایا۔ ہفتے کی شام لندن والوں کے لئے ایک میلے سے کم نہیں۔ اور گرمی کے دنوں میں جب سورج رات کے گیارہ بجے غروب ہو تو بازاروں کی چہل پہل بہت رات گئے تک باقی رہتی ہے۔ ٹیکسی والا ان بازاروں میں سے گھماتا پھراتا اسٹیشن پر جا پہنچا۔

انگلستان کے ریلوے اسٹیشنوں پر قلی سرکاری ملازم ہوتے ہیں۔ اور مسافروں کا سامان اٹھانے میں ہاتھ بٹانا ان سب کا سرکاری فرض ہے۔ عام طور سے لوگ اسقدر کم سامان ہمراہ لے کر سفر کرتے ہیں کہ قلی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ میرا سامان زیادہ تھا اس لئے اِدھر اُدھر بھاگ کر میں نے قلی کو تلاش کرنا چاہا۔ آجکل لندن کے ریلوے اسٹیشنوں پر عورتیں قلی کا کام کرتی ہیں۔ ایک عورت نے میری پریشانی کا اندازہ لگا کر کہا کہ آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔ میں نے کہا ہاں سات آٹھ عدد بکس ٹرین تک لے جانے چاہتا ہوں۔ اُس نیک بخت نے فوراً کہیں سے ایک بڑا سا ٹھیلہ مہیا کیا۔ اور میرا سامان اس پر لاد آگے آگے چل دی۔

اگر امن چین کا زمانہ ہوتا تو شاید ریلوے اسٹیشن پر روشنی کی وجہ سے دن نکلا نظر آتا۔ مگر بلیک آوٹ کی پابندی سے روشنی آدھی کر رکھی تھی دوسرا فرق مجھے یہاں کے ریلوے اسٹیشنوں میں یہ نظر آیا کہ ہندستان میں بڑے بڑے اسٹیشنوں پر لوگ صرف سفر کی غرض سے ہی نہیں جاتے۔ بلکہ جب جی بہلانے کو طبیعت چاہی اُٹھے اسٹیشن چلے گئے۔ اکثر چیزیں جو شہر میں نہیں ملتیں، بعض دفعہ ریلوے اسٹیشن پر مل جاتی ہیں پھر مسافروں کی گھما گھمی اور رونق رونق میں رہی۔ مگر اس ملک میں ریلوے

اسٹیشن سے صرف سفر کا ہی کام لیا جاتا ہے
میرے بہت سے احباب الوداع کہنے کے لئے پلیٹ فارم پر گھوم رہے تھے۔ ان میں سے اکثر ایسے ہندستانی دوست تھے کہ جو بیسوں دوستوں کو ہندستان جاتے ہوئے الوداع کہہ چکے ہیں۔ اور اب الوداع کہنا اور وطن کی واپسی پر رخصت کرنا ان کے لئے ایک عام سی بات ہوگئی ہے۔ اگرچہ ایسے دوستوں نے انگلستان سے ہندستان کا سفر نہیں کیا۔ مگر دوسروں کو الوداع کہتے کہتے انہیں سب راز کی باتیں معلوم ہو چکی ہیں۔ اس لئے ان سے بہتر سفر کی ہدائتیں کون کر سکتا ہے۔

اس الوداعی مجمع میں بڑے خانصاحب بھی موجود تھے۔ اور جس طرح شمع کے گرد پروانے جمع ہو جاتے ہیں۔ سب احباب ان کے گرد لوٹے پڑتے تھے۔ بلکہ عام دیکھنے والوں کو یہی شبہ ہوتا تھا، کہ سب لوگ مجھے نہیں بلکہ بڑے خانصاحب کو الوداع کہنے آئے ہیں۔ بڑے خانصاحب آج رات الوداع کی کوفت دور کرنے کے لئے سرخوشی کی حد سے گذر چکے تھے۔ اس لئے صرف کبھی کبھی ریل کے انجن کی سیٹی سن کر انہیں خیال آجاتا تھا کہ کوئی شخص جا رہا ہے۔ ورنہ یہ سفر اور الوداع کی بندشوں سے بالاتر تھے۔ چنانچہ سارا مجمع ان کے گرد

کھڑا تھا۔ اور یہ ایک بجلی کے کھمبے کے نیچے کھڑے جمہوریت اور عورتوں کی آزادی پر زبردست لکچر دے رہے تھے۔

میں نے جلدی جلدی اپنے لئے ایک جگہ تلاش کی۔ اس پر اپنا کوٹ اور ہیٹ رکھا اور خود ٹرین کے سامنے آنکر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں احباب کا مجمع بڑے خانصاحب کو لے کر مجھ تک پہنچ گیا۔ خانصاحب اب سرمد کی ایک رباعی بار بار پڑھ رہے تھے جس میں غم عشق اور ہگس کا ذکر ہے۔ اور دوسرے مسافروں کے لئے کہ جنہیں فارسی ادب سے ذوق نہیں اسکا بامحاورہ انگریزی زبان میں ترجمہ بھی کرتے جاتے تھے۔ اتنے میں پلیٹ فارم کے اُس سرے سے کوئی پچاس کے قریب جہازی شور مچاتے ہوئے نمودار ہوئے۔ دیوانہ را ہوئے بس است، بڑے خانصاحب نے سرمد، ہگس اور غم عشق کی داستان یہیں ختم کی۔ اور اللہ ہو کا ایک نعرہ مار کر ان جہازیوں کے غول میں غائب ہو گئے۔ خانصاحب کے اس طرح غائب ہونے سے قدرتی طور پر ہم سب کو بہت تشویش ہوئی۔ چنانچہ بہت مشکل سے انھیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر وہاں سے نکالا گیا۔ ورنہ خطرہ تھا کہ ان جہازیوں کے ساتھ کہیں خانصاحب بھی روانہ نہ ہو جائیں

اتنے میں سترین نے پرچہ لگایا کہ اس ٹرین کے ساتھ سونے کے لئے علیحدہ ڈبے لگائے گئے ہیں۔ اور ان کا ٹکٹ خرید کر مسافر آرام سے

پاؤں پھیلا کر سو سکتا ہے۔ جلدی سے ایک سونے کے کمرے کا ٹکٹ خرید لیا اور میرا سامان اِس نئے کمرے میں پہنچ گیا۔ سیٹ پر ایک تکیہ اور ایک کمبل رکھا تھا اُس پر جا کر میں نے قبضہ کر لیا۔ باہر نکل کر دیکھا تو خانصاحب حافظ کی مشکلہا اور ساحلہا والی غزل پڑھ رہے ہیں۔ میں نے اِس موقع کو غنیمت سمجھا اور سب دوستوں سے بغل گیر ہو کر الوداع کہی۔ خانصاحب نے جب سب کو بغل گیر ہوتے دیکھا تو سب سے قریب جو لڑکی کھڑی تھی اس سے الوداعی جُملے کہنے شروع کر دیئے۔ انجن نے سیٹی دی میں نے گاڑی کی کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر رومال ہلایا۔ گاڑی آہستہ آہستہ روانہ ہوئی۔ سب نے خدا حافظ کہا۔ خانصاحب نے اپنے دانتوں کا چوکا مُنہ میں سے نکال جیب میں رکھا اور اس لڑکی سے خدا حافظ کہنے میں مشغول ہو گئے۔

لندن کی مدھم روشنیاں آہستہ آہستہ رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئیں۔ میں چند منٹ تک کھڑکی میں سے کھڑا لندن کی عمارتوں کے سائے تاریکی میں اوجھل ہوتے دیکھتا رہا۔ اور اسکے بعد اپنی سیٹ پر آ کر لیٹ گیا۔

آج پورے چار سال پہلے اِسی پلیٹ فارم پر میری گاڑی آ کر رُکی تھی اور چار سال بعد اُسی پلیٹ فارم سے میں رخصت ہو رہا تھا۔ مگر کیسے غضب کے تھے یہ چار سال۔

بحیرۂ احمر۔ یکم ستمبر ۱۹۴۳ء

یہ چار سال

پورے چار سال ہوئے کہ میں نے پہلی دفعہ انگلستان کے ساحل پر قدم رکھا تھا۔ اُس وقت لڑائی چھڑ کر دو ہفتے پُرانی ہو چکی تھی۔ لیکن جنگ کا اعلان ہوتے ہی لوگوں میں جو ایک قسم کا جوش اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے، یہ ابھی تک باقی تھا۔ برطانیہ والے ابھی تک بلیک آؤٹ اور ہوائی حملوں کے عادی نہیں ہوئے تھے۔ میں لورپول سے ٹرین میں بیٹھا۔ گاڑی کا ڈبہ خالی تھا اور میں تھکا ہوا۔ اِس لئے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہی سو گیا۔ رات کو آنکھ کھلی تو دو سپاہی باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر تک تو میں اُن کی باتیں سمجھ نہ سکا۔ کیونکہ جس لہجے میں انگریزی زبان بولنے اور سمجھنے کی مجھے عادت تھی، اِن دونوں کا لب و لہجہ اِس سے بالکل الگ تھا۔ مگر دماغ پر زور دینے سے اُن کی ایک آدھ بات سمجھ میں آئی۔ یہ دونوں سپاہی لڑائی کی باتیں کر رہے تھے اور جنگ کے دنوں میں لڑائی کی باتوں کے سوا اور کوئی بات بھی کیا کر سکتا ہے

اِن دونوں سپاہیوں کو ابھی فوج میں بھرتی کیا گیا تھا۔ اور فرانس کے مورچے پر جانے سے پہلے یہ لندن حاضری دینے جا رہے تھے۔ اِن میں سے ایک سپاہی لگاتار سگرٹ پی رہا تھا۔ اور اس کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ بے حد پریشان ہے، شہری زندگی سے ایکدم فوجی زندگی میں تبدیلی۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ اِس وقت برطانیہ والوں کی عام حالت کیا تھی۔ اِن دونوں سپاہیوں نے پردیسی سمجھ کر مجھ سے بھی بات چیت کی۔ سگرٹ پیش کئے۔ اور لندن کے متعلق دو چار باتیں بتائیں۔

ریل کے ڈبے میں کھڑکی کے شیشوں پر سیاہ پردے چڑھے ہوئے تھے۔ چھت کی روشنی نہایت مدھم تھی۔ ڈبے کی دیوارو پر جگہ جگہ ہوائی حملوں سے بچاؤ کی ترکیبیں لکھی ہوئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے اشتہاروں کے ذریعے جاسوسوں اور مخبروں سے آگاہ کیا گیا تھا۔ اور اِس ڈبے میں ایک ہندستانی اور دو برطانی سپاہی بیٹھے لندن جا رہے تھے۔ یہ میرا برطانی زندگی سے پہلا تعارف تھا۔

چار سال کی مدت ایک قوم یا ایک ملک کے لئے کوئی بڑا عرصہ نہیں۔ مگر لڑائی کے چار سال ایک دیس کی کایا پلٹ سکتے ہیں اِن چار سال ہی میں میں نے وہ زمانہ بھی دیکھا، جبکہ برطانیہ والے حیرت سے

ششدر رہتے۔ برطانیہ کے سر پہ لڑائی ایکا ایکی آن پڑی تھی۔ فرانس کے مورچے پر برطانی فوجیں میجنولائن کی قلعہ بندیوں کے پیچھے بیٹھی تھیں اور عام طور سے لوگوں کو اطمینان تھا کہ ان ہمالیہ جیسی زبردست قلعہ بندیوں کو توڑ کر جرمن آگے نہیں بڑھ سکتے۔ پھر میں نے مئی سنہ ۴۰ء کا وہ دَور بھی دیکھا جبکہ جرمنوں نے نارویے۔ بلجیم۔ ہالینڈ اور فرانس پر چڑھائی کر دی۔ اور میجنولائن کا خواب ایک بھیانک حقیقت بن گیا کیمبرج کے کالج میں جب میں ایک دن صبح صبح پڑھانے گیا تو کالج کے احاطے میں طالب علموں کی جگہ تھکے ہوئے برطانی سپاہی زمین پر لیٹے تھے۔ ان کے چہرے دھوپ سے جھلسے ہوئے تھے ان کے جوتوں پر کئی کئی انگل کیچڑ تھی۔ کچھ سپاہی تھکن سے چور آنکھیں بند کئے پڑے تھے۔ اور کچھ اپنی زنگ آلود بندوقیں صاف کر رہے تھے۔ یہ ڈنکرک کی شکست خوردہ برطانی فوج تھی۔

اگست سنہ ۴۰ء میں لندن پر جرمنوں کے ہوائی حملے شروع ہوئے۔ ان حملوں کو بھی میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا۔ رات رات بھر سر پر جرمن بمباروں کی گونج سُنی۔ زبردست بموں کو اپنے کانوں سے پھٹتے سنا۔ آکسفورڈ سرکس لندن کا سب سے بارونق چوراہہ ہے۔ یہاں قبرستان کی سی خاموشی دیکھی۔ لندن کی سڑکوں پر بموں سے

گرے ہوئے مکانوں اور عمارتوں کا ملبہ اٹھا دیکھا۔ لندن کے پناہ خانوں میں عورتوں اور بچوں کے سہمے ہوئے چہرے دیکھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ہر جگہ یہ آواز بھی سُنی کہ ہم ہمت کبھی نہیں ہار سکتے۔

۲۲ رجون ۱۹۴۱ء کی صبح بھی مجھے خوب یاد ہے، جبکہ روس پر جرمنی کے حملے کا اعلان ہوا۔ لندن کی موٹر بسوں اور ریل گاڑیوں میں لوگ حیرت سے اخباروں کی سُرخیاں دیکھ رہے تھے۔ اور خاموش تھے۔

جولائی ۱۹۴۲ء میں جب جرمن فوجیں بالکل اسکندریہ کے سامنے جا پہنچیں۔ اور تمام مصر خطرے میں گھر گیا تو برطانیہ میں ایک عجیب بے چینی سی نظر آتی تھی۔ اُسی زمانے میں پارلیمنٹ کے چند ممبروں نے مسٹر چرچل کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پیش کی تھی۔ اُس روز جبکہ یہ ممبر مسٹر چرچل پر اعتراض کر رہے تھے۔ میں بھی پارلیمنٹ میں موجود تھا۔ مسٹر چرچل نہایت خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھے اپنی لکھی ہوئی تقریر کے مسودے میں پنسل سے کچھ گھٹا بڑھا رہے تھے۔ پارلیمنٹ میں ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے آگ سی لگا دی۔ وہی مسٹر چرچل کہ جن کی تقریروں سے تمام ملک میں ایک جوش پیدا ہو جاتا تھا۔ اُس روز پارلیمنٹ میں اپنی صفائی پیش کرنے والے تھے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ جمہوریت کی

طاقت کس قدر زبردست ہے جرمنی میں بھلا کس کی مجال ہے کہ ہٹلر کے سامنے کان بھی ہلا سکے۔ مگر اس دن جمہوریت کی سب طاقتیں سٹر چرچل پر نہایت بیباکی اور صفائی سے اعتراض کرنے کے لئے پارلیمنٹ میں جمع تھیں۔

سنہ ۴۲ء اور سنہ ۴۳ء میں آخر لڑائی کی بازی پلٹنے لگی۔ لیبیا میں جرمن فوجوں کو شکست ہوئی۔ ٹیونس کی فتح کا اعلان ہوا۔ اور ۲۵ جولائی سنہ ۴۳ء کی صبح کو لندن والوں نے جب اخبار دیکھا تو پہلے صفحے پر مسولینی کے زوال کی خبر تھی۔ مگر اس دن بھی لندن والے خوشی سے دیوانے نہیں ہوئے۔ لندن کے بازاروں میں سب کو میں نے اسی طرح کام کاج پر جاتے دیکھا۔ البتہ ان کے قدموں میں استقلال اور عزم کے آثار زیادہ نظر آتے تھے۔

ان چار سال میں انگریز قوم کے چھوٹے اور بڑے سب قسم کے لوگوں سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ انگریز مزدوروں اور کاریگروں کو کارخانوں میں کام کرتے میں نے دیکھا ہے۔ انھیں چار سال میں دیکھتے دیکھتے برطانی ریلوے اسٹیشنوں پر مرد قلیوں کی جگہ عورتیں اسباب اٹھانے لگیں۔ بیٹوں اور بھائیوں کی جگہ ان کی ماؤں اور بہنوں نے لے لی۔ مگر انگریز قوم کے استقلال میں میں نے کبھی فرق آتے نہیں دیکھا۔

بی۔بی۔سی میں بجلی کا لفٹ چلانے پر ایک بڑھیا مقرر ہے۔ اس کا بڑا لڑکا جرمنی میں قید ہے۔ چھوٹا بیٹا افریقہ میں کام کر رہا ہے۔ اور یہ عورت ہمارے

دفتر میں ملازم ہے۔ اس سے میں نے بارہا باتیں کی ہیں۔ مگر کیا مجال جو یہ کبھی اُداس یا غمگین نظر آجائے۔ میرے مکان کے نیچے ایک بڑے میاں سڑک کے کنارے دکان لگائے سگرٹ بیچتے ہیں۔ ان کا لڑکا برطانیہ کے جنگی بیڑے میں کپتان ہے اور بڑے میاں جب کبھی اپنے بیٹے کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارا برطانی بیڑہ گویا انھیں سلامی دے رہا ہے۔

آج چار سال بعد میں اس ملک سے رخصت ہوتا ہوں لیکن ان چار سال میں جس محبّت اور یگانگت کا سلوک برطانیہ والوں نے مجھ سے کیا یہ ہمیشہ میرے دل پر نقش رہے گا۔

کیمبرج۔ آکسفورڈ۔ اور لندن کے اکثر جلسوں میں مجھے ہندستان کے بارے میں تقریر کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ لندن کی صحبتوں میں بارہا لوگوں نے مجھ سے میرے ملک کا ذکر کیا ہے۔ اور ان سب باتوں سے مجھے یقین ہوتا ہے کہ برطانیہ والوں کے دل میں میرے ملک ہندستان کی کتنی عزّت ہے ہر ملک اور ہر قوم میں کچھ نہ کچھ خوبیاں ضرور ہوتی ہیں۔ کاش ہم ایک دوسرے کی خوبیوں کو زیادہ پرکھ سکتے۔ اور قومیں ایک دوسرے کو اور زیادہ سمجھنے کی کوشش کریں پھر یہ دنیا کسقدر خوشگوار جگہ بن جاتی۔

آغا اشرف کی دُوسری تصنیف

بچّوں کا لندن

"لندن سے آداب عرض" پڑھنے کے بعد آغا اشرف کی لکھی ہوئی دوسری کتاب بچّوں کا لندن ضرور پڑھئے۔ بی۔بی۔سی لندن سے اشرف چچا نے جو دلچسپ حالات بچوں کے لئے براڈکاسٹ کئے تھے۔ اور جن کا مصر۔ عراق۔ ایران۔ افریقہ اور امریکہ تک میں چرچا ہو رہا ہے۔ اب یہ سب مضامین کتاب کی شکل میں چھپ کر تیار ہیں۔ اور ان میں صرف بچّوں ہی کی دلچسپی کا سامان نہیں ہے۔ بلکہ بچّے اور بڑے ان پُر از معلومات مضامین سے لطف اٹھا سکتے ہیں:

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

ہوائی حملے

لندن پر جرمنوں کے بم برسنے کا آنکھوں دیکھا حال اب تک آپ صرف اخباروں میں پڑھتے تھے یا ریڈیو پر سنتے تھے۔ اب آغا اشرف نے لندن کی بمباری کا پورا حال لکھ کر چھپوا دیا ہے۔ جب لندن پر قیامت کے بم برسے ہیں تو آغا اشرف اسوقت خود لندن میں موجود تھے۔ بموں سے کیسی ہیبتناک تباہی ہوئی اور بربادی کا حال۔ لندن والوں کی ہمت کی داستان اور بموں سے بچاؤ کی ہدائتیں اگر آپ پڑھنا چاہیں تو "ہوائی حملے" ضرور پڑھیے۔ اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر خدانخواستہ کبھی آپ کے شہر پر بم گریں تو ان بموں سے بچاؤ کے لئے شہری کیا کیا تدبیریں اختیار کر سکتے ہیں۔ قیمت ۱۲ ار

مبادیٔ علم المعیشت

معاشیات جیسے خشک مضمون کو آغا اشرف نے نہایت دلچسپ اور سادہ زبان میں اس طرح لکھا ہے کہ اس مشکل مضمون کی گتھیاں آئینہ ہو جاتی ہیں۔ آجتک اردو زبان میں اکنومکس پر اس سے زیادہ آسان اور دلچسپ کتاب نہیں چھپی۔ انگریزی زبان میں اکنومکس پڑھنے سے پہلے مبادیٔ علم المعیشت ضرور پڑھ لیجئے، آپکی سب مشکلیں حل ہو جائیں گی۔ قیمت ۱۲ ار

تحفۂ ادب

میر امن سے لے کر موجودہ دور کے بڑے بڑے انشا پردازوں اور استادوں کے مضامین نثر و نظم کا انتخاب نہایت محنت اور سلیقے سے کیا گیا ہے۔ حصہ نثر میں انتخاب کی خوبی یہ ہے کہ اردو زبان کی تدریجی ترقی مبتدیوں کے علم میں آجاتی ہے۔ اور ادب کے ساتھ طلبا زبان کی تاریخ سے بھی واقف ہو جاتے ہیں۔ حصہ نظم میں جملہ اصنافِ نظم کو الگ الگ منتخب کیا ہے۔ اور ہر صنف سے پہلے اس کی تعریف بھی کر دی ہے۔ تحفۂ ادب کیمبرج یونیورسٹی اور ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ اور اس کے علاوہ ادب کے دلدادہ بھی اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ قیمت عــہ

تریاہٹ اور دو ڈرامے

تعلیم بالغان کے سلسلے کی ایک مفید کتاب۔ یہ ڈرامے خاص طور سے بالغوں کیلئے لکھے گئے ہیں زبان سہل اور طرزِ بیان دلچسپ ہے۔

قیمت ۴ر

آبِ حیات کے لطیفے

اُردو شعرا کی زندگی کے حالات آپ نے مولانا آزاد کی مشہور تصنیف آبِ حیات میں ضرور پڑھے ہوں گے۔ اور اسی ضمن میں وہ دلچسپ ادبی لطیفے بھی آپ کی نظر سے گذرے ہوں گے کہ جن پر ہماری زبان کی بنیادیں قایم ہیں۔ اِن لطیفوں کو اب ایک خوبصورت کتاب کی صورت میں چھاپا گیا ہے۔ اور شروع میں مولانا محمد حسین آزاد کے مکمل سوانح حیات ہیں۔ جو آج تک کبھی اس طرح شایع نہیں ہوئے تھے۔ کتاب بے حد دلچسپ ہے۔ اور ادبی معلومات کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

قیمت ۸؍

ڈاکٹر صاحب

ایک ڈاکٹر صاحب نے اپنی ہمت اور محنت سے ایک گاؤں کی کایا کیسے پلٹ دی۔ تعلیم بالغان کے متعلق ایک بہت دلچسپ اور پُرمعنی کہانی۔ باتصویر

قیمت ۴ر

سب کتابوں کے ملنے کا پتہ

حالی پبلشنگ ہاؤس۔ کتاب گھر۔ جامع مسجد دہلی